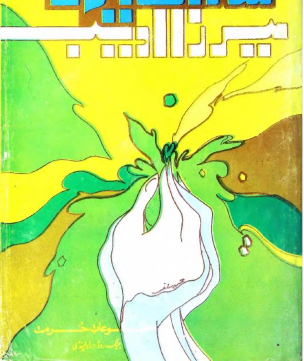


سازمان جریان

سیر زانده



طرح و نگارش: حسن سرمد

تألیف: دکتر محمد علی



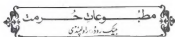
PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



ساتواں چراغ

میرزا ادیب



جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

تمام کتاب	_____	ساتواں چھاپ
مصنف	_____	میرزا ادیب
طبع اول	_____	۱۹۸۳ء
تعداد	_____	ایک ہزار
مطبع	_____	محمد شہید پرنٹرز، ایف، اسلام آباد
ناشر	_____	ذام ملک
قیمت	_____	۲۰ روپے

ترتیب

۹	ایمانت
۳۷	ساتواں چہرہ
۵۱	تحریر میں
۶۲	سائزہ
۷۲	ہندگی، بڑا مسند
۹۷	ریڑھی
۱۰۰	عنایت بی بی کا افضال
۱۲۱	درویش
۱۲۸	کھنڈ کی ناؤ
۱۶۳	عیا کی نفی
۱۷۷	اس کی خاطر
۱۹۷	ایک منزل، کئی راہیں

پیش لفظ

میرزا ادیب کی شخصیت اور فن کے کئی پہلو ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ افسانہ، ڈرامہ، تنقید، ترجمہ اور کالم نگاری میں انہوں نے اردو ادب کی گراں بہا خدمات سر انجام دی ہیں۔ اور اپنی زندہ روح، متحرک ذہن اور وسیع تخیل کے ساتھ ادب کی دنیا میں گراں بہا اضافے کئے ہیں۔ انہوں نے بہت سی اصنافِ سخن کی روایات کو آگے بڑھایا ہے اور انہیں وسعت، گہرائی اور تازگی سے آشنا کرایا ہے۔

میرزا ادیب کے اکثر افسانوں میں زندگی کی چھائی اور فن کے خلوص کی تاثیر نظر آتی ہے۔ ان کے ان زندگی اور فن میں باہمی ربط کچھ یوں قسما ہے کہ افسانہ اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی کی حقیقتیں افسانہ کو دکھائی جاتی ہیں اور افسانہ مثبت قدروں کی ترویج کا ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ وہ جیتے جاگتے کرداروں اور معاشرتی قدروں کا خوبصورت چرچہ میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے اہم چیز زندگی سے وابستگی ہے۔ جس معاشرے کا وہ عکس پیش کرتے ہیں وہ ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر مجرم سے "ساتواں چراغ" کے کم و بیش تمام افسانے زندگی اور فن کے حسین امتزاج کا خوبصورت مرقع ہیں۔ تاہم "امانت"، "نیرحمی"، "بند غلی کا مسئلہ"، "محبتِ بی بی کا افضال" میں ہیں زندگی کی حقیقتیں اپنی پوری جزئیات کے ساتھ دھڑکتی نظر آتی ہیں۔

میرزا ادیب کے افسانوں کا پس منظر، انسانی فطرت اور معاشرتی زندگی کے ایسے مظاہر ہیں جو صرف گہرے مشاہدے سے فنکار کے تجربے کا جزو بن سکتے ہیں۔ ایک دو افسانوں سے قطع نظر، انہوں نے اپنی کہانیوں میں خیالی یا تصوراتی دنیا بنانے کی بجائے محسوس اور

زندہ حقیقتوں سے سروکار رکھا ہے۔ اور ان حقیقتوں کا اور ان انہوں نے اپنے عہد کے معاشرے سے حاصل کیا ہے۔ وہ صرف ان حقائق کو اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ جن سے ان کا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اور جن کا مشاہدہ انہوں نے قریب سے کیا ہوا ہے۔ ان کے افسانے "سازہ" خلیا کی مٹی، اور کاغذ کی لٹو، فنی تھانوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ اور حقیقتوں کے اور ان میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ "سازہ" میں "سازہ" اور برشے میاں دونوں مصیبت آمیز جھوٹ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مگر معصومیت کا یہ عالم ہے کہ دونوں پر بے اختیار پیرا آنے لگتا ہے۔

میرزا صاحب نے متوسط گھرانوں کے ماحول اور مسائل سے جس روشناس کر لیا ہے اور اپنے چرخے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا ہے۔ کہ ان گھرانوں میں مسائل لینے والی زندگی میں تنوع بھی ہے اور کشمی بھی۔ اس میں معاشرت، اخلاق اور رومان کے بے شمار مذاہم اور عکس موجود ہیں اس ماحول میں انہوں نے حسرت و یاس کے مرقعے تلاش کئے ہیں اور ان میں اپنے دل کی ٹپ ٹپ اور درد و غم کی تاثیر شامل کر کے دوسروں کو بھی اپنا مونس و غمخوار بنایا ہے۔ ان کے افسانے جہاں ایک طرف متوسط طبقے کی معاشرتی اور خانگی زندگی کے بہتر مرقعے ہیں۔ وہیں دوسری طرف فن کے حسن و جمال اور تحرک کاری کے دل نشیں نمونے بھی ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی کی پیچیدگیوں میں ایسے موضوع نکال لیتے ہیں جنہیں دوسرے غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ معمولی سے معمولی موضوع میں فطرت انسانی کے ایسے مظاہر دیکھتے ہیں کہ زندگی کی معمولی سی حقیقت بھی بڑی اہم معلوم ہوتی ہے۔ انہیں یہ بھی احساس ہے کہ زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی ایسا نہیں جس میں ایسے افسانے کے امکانات پوشیدہ نہ ہوں۔ موضوع کے انتخاب میں بھی ان کے یہاں بڑا تنوع ہے۔ ان کا موضوع ایک ہی وقت میں فرو بھی ہے اور معاشرہ بھی۔ داخلی کیفیتیں بھی ہیں اور خارجی مظاہر بھی۔ "گریٹ مین" اس کی خاطر "ڈیوڈ" چند ایسے افسانے ہیں جو تحریر کے ذہن پر لٹوالی تاثیر مرتب کرتے ہیں۔

کردار نگاری کے فن میں بھی میرزا صاحب کو مکمل دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے

اپنے کرداروں کا مظاہرہ اور مشاہدہ بڑی باریک بینی اور شدت سے کیا ہے اور اس مشاہدے اور مطالعے کے بھرپور میں سے ہر ایک کو اپنے تخیل میں بسایا اور ٹکڑے نکھارا اور اور اونچا کیا ہے۔ انہوں نے عموماً روایت اور حدیث کو پوری طرح ہم آہنگ کرنے کو اپنا فنی مسلک بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں حدیث اور روایت دونوں کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ دونوں کو حیات الہی فنی ہوئی معلوم ہوئی ہے۔ میرزا ادیب پوری کوشش سے اپنی بات کے انہماک کے لئے اچھے سے اچھا اسلوب کاٹل کرتے ہیں۔ مشاہدہ میں وہ جزئیات کی جستجو میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا فنی ان کی شخصیت کے انفرادی اور امتیازی عناصر کے رچاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح ان کے منظر و فکر کی تہنیتی، جذباتی انداز اور موضوع و فنی میں پوری طرح فکری ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ "ایک منزل کئی راستے" ان کا شاہکار افسانہ ہے اور فنی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔ ان کا اسلوب حد درجہ خلقت ہے اور رومانیت کی بجلی سی چاشنی تحریر کا لطف دو بلا کویتی ہے۔ افسانہ گریٹ میں "میں نوران کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"شاید وہ (نوران) اس تاریکی میں کسی ایسی کڑی کی تلاش میں تھی جو اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر جائے"

"اپنے افسانے "سازہ" میں بوٹھے کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"نہ تو طلوع آفتاب سے پہلے جہاں تھاں بکھرے جگہی اُجاڑوں سے اسے کوئی دلچسپی تھی نہ غروب آفتاب کے بعد بلندیوں سے اُترتے ہوئے شفق آکورد و حند مکوں کو وہ پُر شوق نظروں سے دیکھتا تھا۔"

ایک اور افسانے "ایک منزل، کئی راستے" میں اُن کے قلم کی جولانیاں ملاحظہ ہوں:

"لاشد نے کسی پریشہ کو مریضہ کی طرف حذر سے دیکھا۔ لڑکی کیا تھی۔ سنگ مرمر سے ترشی ہوئی ایک گڑیا تھی۔ سیاہ زلفیں رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی کہ تنفس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔"

”کافذ کی ناک“ میں سے ایک انتخاب ملاحظہ فرمائیے :

”نصیر خاوش قصبی۔ اس کے ہونٹ ایک لڑائی خفی سے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جھپکی ہوئی تھیں اور پٹکوں پر سائے سے لڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔“

مرزا ادیب کے ہاں لگا ہے گا ہے پراسرار قسم کے کرداروں سے بھی بالا پڑتا ہے۔ افسانہ ”ساتواں چراغ“ میں ہم اس قسم کی عبارت سے دوچار ہوتے ہیں :

”پانچویں جمعرات کو جب اس نے چراغ جلا کر مزار کے پہلو میں رکھا اور مدھم مدھنی میں دُعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو اسے یکدم احساس ہوا کہ ایک سایہ اس کے قریب حرکت کر رہا ہے۔ اور اس احساس کے باوجود اس کے منہ آواز ہونٹ جلتے رہے۔“

”دونوں ہاتھ پھیر کر وہ مڑی۔ اس نے دیکھا کہ ایک جلا ہوا چراغ مزار کے دوسرے پہلو کی طرف جھکا جا رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک دھندلا سا جہر دکھائی دینے لگا۔ جس کے گرد دوپٹہ پٹا ہوا تھا۔“

میرزا ادیب نے روایت ”مشاہدہ جنین اور قصور کی دکھائی ہوئی مدھنی میں نئے نئے جہاں آباد کئے ہیں۔ ان کے انسانوں میں زندگی کے ساتھ ایک ربط اور تعلق پیدا کرنے کی جو فلاں خواہش ہے۔ وہ ان کے افسانوں کے عنوان اور موضوع کے انتخاب سے ظاہر ہے۔ ان کے ہر افسانے میں قدم قدم پر زندگی کی جھلک سناٹی دیتی ہے۔ ان افسانوں کے دامن میں آنسوؤں کے موتیوں کی بھی وہی کثرت ہے جو مسترت و شادمانی کے پھولوں کی۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے ہر جگہ سے جگے تنفس کی جھلک سناٹی دیتی ہے۔ انہوں نے انسان کے دل میں جھانک کر اس کے ہر چھوٹے بڑے راز کی عکاسی کی ہے۔ ان افسانوں میں ”مشاہدہ“ احساس اور فکر کی مکمل ہم آہنگی موجود

ہے۔ فنی انہماک اور توجہ کے ساتھ ساتھ بیان کی لطیف شعریت کا بڑا صحیح امتزاج ہے۔ ان کی مصوری میں فکر کی گہرائی، تخیل کی رنگینی اور موضوع کی سادگی اور نزاکت پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

کرنی غلام سرور (شاہد امتیاز دہلوی)

امانت

دھیر کے آخری ہتے میں بیٹکوں کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ شرف کو سات سات آٹھ آٹھ بجے تک صوف کا رہنا پڑتا ہے اور غیر امد تو بنک کا پانچ بجتا اس کے عہد سے کا قضا اٹھا کر اپنے شرف کے ساتھ بیٹھے اور ہر کام اپنی نگرانی میں کر آئے۔ اس کی بیوی رضیہ کو اس کا بھائی صم تھا۔ صم دھیر دھ پانچ چھ بجے ہی شوہر کو ٹیلیفون کر کے بھائی آئے کی تاکید کر دیتی تھی کہ بچے اس کے آتے سے پہلے صوف نہ چائیں بچے پانچ بجے سے باپ کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ اس روز بھی رضیہ نے یہ جلتے کے باوجود کہ اس کے شوہر کا جواب کیا ہوگا اس سے آتے کا وقت پوچھ لیا۔

بھئی جلدی کیونکر آسکتا ہوں؟ بے پناہ کام ہے۔ آج تو نو بجے آنا بھی بڑا مشکل ہے۔ رضیہ نے یہ اطلاع دے کر بیوی کو ایس کر دیا۔ رضیہ ریوڑ رکھنے ہی والی تھی کہ رضیہ نے پوچھا: آج کی کوئی خاص خبر؟

خبریں کیا ہوں گی؟ بچے بار بار پوچھتے ہیں ابو کب آئیں گے۔ اور تو کوئی خبر نہیں۔ ڈاک من جن خط آتے ہیں۔
کس کس کا ہے؟

ایک کامیڈ رائٹنگ فرم پر مانی ہوں۔ آپ کے مہمانی جان کا ہے۔ دوسرے میں دکاندار کا غالباً ملی ہو گا۔ برسوں شاپنگ کی تھی نا؟ اور یہ لٹانے کے کونے میں انصاف اچھا لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ صاحب کون ہیں۔

”خط کہاں ہے الطاف احمدا کا؟“

رضیہ اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی، بولی، کیا اس میں کوئی بہت بڑا راز ہے؟ اس کی پیشانی ٹھکن اور ہو گئی تھی۔

”نہیں اس میں کوئی راز نہیں۔۔۔ البتہ اس سے ایک کہانی وابستہ ہے۔“ ضمیر نے کہا اور یہودی کے اخصوں کی طرف اس موقع سے دیکھنے لگا کہ ابھی یہ خط اسے مل جائے گا، مگر یہ دونوں ہاتھ خالی تھے۔

”خط؟ رضیہ!“

خط آپ کے نام ہے۔ آپ ہی کو ملے گا، لیکن آج یہ آپ کا دورہ! میں کچھ سمجھ نہیں سکتی۔ رضیہ نے سر کو جھٹکا دے کر سامنے بڑا جانے والی اسٹ کر بیٹھے، سنایا اور رشید کو غور سے دیکھا۔ ضمیر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ سفدت کے انداز میں کہا، رضیہ! بھئی.....“

کہہ کر وہ اسے خط آپ کا ہے میں کون ہوتی ہوں اس کے بارے میں پوچھنے والی۔۔۔ بچنے! اور رضیہ نے میز پر سے ٹیلیفون ڈائز کھڑی ہٹا کر تینوں خط اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیئے اور خود چپ چاپ ایک طرف گھڑی رہی۔

رضیہ! ضمیر نے سجدگی کے ساتھ کہا شروع کیا، ٹیکسیز کے کردار پولٹ نے اپنے فلسفی درست سے کہا تھا کہ اس آسمان اور زمین میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا ذکر تہادے فلسفے میں نہیں ملتا کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ریٹا ہر بڑی صدولی معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی تہد میں انسانی دل کے کچھ بڑے گہرے راز چھپے ہوتے ہیں۔

رضیہ نے اس خیال سے کہ اس کے شوہر نے اس کی سکرپٹ کا ڈراما ہے، روٹی صورت بنالی اور شوہر سے مخاطب ہو کر بولی،

”آپ درست کہتے ہیں، مہر حال کہا، اگلیے؟“

سب کوسوں پر پہنچ گئے۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ رضیہ جب بھی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی تھی۔ اسے اس کے چہرے پر ایک اندرونی اضطراب کے واضح اثرات نظر آتے تھے۔

ضمیر کھانے کے بعد دو تین سگریٹ پیتا تھا۔ بچوں سے دن بھر کی روادوستا تھا اور بھرانہیں کچھ پیٹنے سا کرہنسا ابھی تھا۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ لیکن اس وقت وہ کچھ کہے بغیر اٹھا اور اوپر کے کمرے میں جانے کے لئے میز چیلڈی کرنے لگا۔ اوپر اس کا خالص کمرہ تھا جس میں اس کا ذاتی سامان ترتیب دیا گیا تھا۔

بچوں کے اندازہ لگا چکے تھے کہ آج کوئی خاص بات ہوئے والی ہے۔ وہ چند منٹ وہیں بیٹھے رہے۔ ماں نے انہیں اپنے اپنے بستر پر چلے جانے کے لئے کہا اور وہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگے۔

رضیہ نے یونہی ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ آدھ گھنٹہ بیتا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ضمیر خواب گاہ میں نہ آیا۔

”یہ اوپر کیا کر رہے ہیں با رضیہ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ایک مبہم ہی پریشانی اس کے دماغ میں رہ گئی تھی۔“

”رضیہ! اوپر سے آواز آئی۔“

”جی۔“

”ذرا اوپر آؤ۔“

اس نے کمرے کے اندر قدم رکھا، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کمرے میں جتنے سوٹ کپڑے تھے ان سب کے کپڑے باہر کچھ پر پڑے تھے اور باوجودیکہ وہ دیکر کا سینہ تھا، ضمیر جیسے میں غرابور دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ آپ نے کیا کر دیا ہے با رضیہ نے سوال کیا۔“

”میرا کوئی ٹرنک نیچے تو نہیں؟“ ضمیر نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے استفسار کیا۔

”نہیں تو۔۔۔ یہی چار سوٹ کیس ہیں آپ کے۔“

”ایک ٹرنک بھی تھا۔ پرانا، کالے رنگ کا۔ وہ کہاں ہے؟ کیا تم کو خبر نہیں وہ ٹرنک میرا ہے۔ اس میں میں نے اپنے کچھ کپڑے رکھے تھے۔ کہاں ہے وہ؟“
رضیہ کچھ سوچنے لگی۔

”بتائی کیوں نہیں ہو۔؟“

رضیہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: پرانے مکان سے اس مکان میں آنے، تو کچھ بے کار چیزیں ادھر ادھر ہارنٹ دی تھیں۔

”ادھر ادھر ہارنٹ دی تھیں، ایک یہ مطلب؟“

”پرانی اور بے کار چیزوں کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ مکان میں ان کی گنجائش بھی کہاں تھی؟ میں پوچھتا ہوں۔۔۔ میرا وہ ٹرنک کہاں ہے؟“

ضمیر حاتم طوہر پہلے جذبات کو قابو میں رکھنا چاہتا، لہذا وارنٹ سے بولنا اس نے کبھی مناسب نہیں سمجھا تھا، مگر آج جیسے ساری امتیاطوں کا واسن اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کہاں ہے وہ ٹرنک؟ وہ دوبارہ مگر بار۔

رضیہ نے وارنٹس ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ اس میں سے سنے پڑے نکال لئے تھے۔

”اور وہ کیل؟“

”ٹرنک چراغ بی بی کے حوالے کر دیا تھا۔“

”اس میں کیل بھی تھا؟“

اب رضیہ کے لہجے میں بھی کسی قدر خشکی در آئی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ پرانا کیل آپ کو اس

قدر عزیز ہے میں نے اسے بے کار سمجھا تھا، بتا دیا ہوتا، تو میں سینے سے دھاک کر رکھتی۔

ضمیر نے تیز نظروں سے یہی کر دیکھا۔ جب میں نے اسے اپنے ٹرنک میں محفوظ کر رکھا تھا،

قویہ میری بد مذاقی نہیں تھی۔ مثنوی دہی چیز کی جاتی ہے جس کی ضرورت ہو تم مجھ سے پہچ نہیں
سکتی تھیں؟

آپ بھی تو کہاں کرتے ہیں: رضیہ کی تہا از بھی بلند ہو گئی تھی۔

کیا کمال کرتا ہوں؟

ایک پرانی بے کار شے بڑی تھی جسے کبھی استعمال نہیں کیا گیا تھا میں نے ہی سوچا کہ گھر میں
بے کار جہ پڑی ہے، تو کسی غریب ہی کے کام آ جائے۔ اس لئے دوسرے پھنے پرانے کپڑوں کے
ساتھ اسے بھی نوکرانی کو دے دیا۔ کیا میں نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا؟ پہلے کرنی پڑا آپ
سے پہچے بغیر نوکرانی یا کسی اور کو نہیں دیا تھا! اس مرتبہ خاص طور پر آپ سے پہچنے کی کیا
ضرورت تھی؟

ضمیر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ رضیہ میڑھیوں کی طرف جانے لگی۔

”منو! مجھے یہ کیوں واپس لینا چاہیے؟“ ضمیر نے ٹھکانا پیچھے میں کہا۔

رضیہ نے ایک لمحے کے لئے رک کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ بوری بچیدگی سے انصاف کا بعد امتداد
وہ نیچے اترنے لگی۔ ایک ایک میڑھی پر رکتی ہوئی ضمیر کا آخری فقرہ ایک کوسنی طرح اس
کے ذہن میں جھینٹے لگا تھا یہ نہیں کہ تیرہ برس کی ازدواجی زندگی میں شوہر کے ساتھ اس کے اختلافات
نہیں ہوئے تھے۔ کئی بار ہونے تھے اور تلخ کھائی کی وجہ سے انہوں نے کئی کئی روز تک ایک
دوسرے سے ٹھٹھو بھی نہیں کی تھی۔ مگر اس سے پہلے کبھی اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کے
درمیان جگہ ان کی سبلی سی بات پر ہوا ہے اور اس بار تو وہ شوہر کی اس ناقابل برداشت زیادتی کی
وجہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک پرانا کپڑا کسی کو دے دیا۔ اس میں میں نے جرم کیا کیا ہے؟ یہ سوال اس کے دل و دماغ
پر کچھ کے نگار مل تھا۔

دو نیچے آئی۔ بچوں کی خواہش کے مطابق کھانا کھانے کا لالچ بل دیا تھا اور وہ سوچے تھے۔

اس نے جی بھادی۔ کمرے کے باہر صحن کی جی روشن تھی اور یہ جی ساری رات جلتی رہتی تھی۔ وہ اس جی کے نیچے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہاں کافی سوری تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے چل رہے تھے مگر نہ جانے اسے اپنے اندر ایک ہزار کن تپش کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ اپنے شوہر کے رویے پر غور کرتی جاتی تھی، یہ تپش بڑھتی جاتی تھی۔

اب وہ اوپر کیا کر رہے ہیں؟ اچانک اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا آیا۔ کیا پھر سامان کو الٹ پلٹ کر رہے ہیں؟

اس کے اندر ایک خواہش نے سر اٹھایا کہ اوپر جا کر دیکھے اور وہ اس خواہش کو مضبوط کر لی۔ کمرے سے روشنی باہر آ رہی تھی اور اس کو نے میں جہاں قیو آدم سیف پڑا تھا، اس کا شوہر کھڑا تھا۔ اس نے ایک آتھ سیف پر رکھا ہوا تھا۔ رخ دیوار کی طرف تھا۔ اس نے غرا کر فرش پر نظر ڈالی، رضیہ اندر آ جا؟

رضیہ یہ سوچ کر پہچان ہو گئی کہ انہیں اس کی موجودگی کا علم کیونکر ہو گیا ہے۔

آ جا در رضیہ؟

ضمیر نے دوبارہ کہا اور جب رضیہ نے اندر قدم رکھا، تو اس نے فرش پر اپنا سایہ بکھیر لیا۔ وہ اب کبھی کہ جب وہ کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی، تو اس کا سایہ اندر فرش پر پھیل گیا تھا۔ ضمیر نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔ میں جانتا ہوں تمہارے دل پر کیا گز رہی ہے۔ غالباً میرا دیر تمہارے لئے ایک تھا بن گیا ہے؟

غالباً نہیں یقیناً۔ رضیہ نے شوہر کو مخاطب کئے بغیر کہا۔

بیٹھ جاؤ اور یہ کہہ کر اس نے بیوی کو اس آرام کرائی میں بٹھا دیا جس میں بیٹھ کر وہ چھٹی کے دن کوئی کتاب یا رسالہ پڑھا کرتا تھا۔ اس نے دوسری کرسی آرام کرسی کے برابر کھسکا لی اور خود اس میں وضو کیا، رضیہ! میں نے تم سے کہا ہے کہ اس لٹانے کے ساتھ ایک کہانی وابستہ ہے اور یہ کہانی میں تمہیں سنائے دیتا ہوں۔ سُنو گی؟

رضیہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے کوئی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔
 کم و بیش تیس برس گزرے ہیں ایک ہوٹل کے کمرے میں اپنے بچپن کے دوست نواز احمد
 کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اور اس محبت کی ایک بڑی
 وجہ یہی کبل تھا۔
 کبل؟

ہاں کبل۔۔۔ ہم دونوں غریب و لدین کے بیٹے تھے مشکل سے گزراوقات ہوتی تھی۔ تم
 پوچھنا چاہتی ہو گی کہ ہماری محبت میں کبل نے کیا کیا تھا! جاناہوں۔ چارے پاس صرف یہی
 ایک کبل تھا اور یہ میرا نہیں، میرے روم میٹ یعنی نواز احمد کا تھا۔ یہ ہم دونوں کا ایک طرح
 سے مشترک اثاثہ بن گیا تھا اور وہ یوں کہ جب بھی کسی کو اپنے گھر جانے کی ضرورت پڑتی تھی۔
 تو وہ بلا تکلف یہ کبل ساتھ لے جاتا تھا اور وہ اپنی پرساتھ لے آتا تھا۔ ایک بار مینبرسی دہم
 کا تھا۔ گھر سے خط آیا کہ آبائی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ میں پریشان ہو گیا اور فوراً گھر
 روانہ ہونے کی تیاری کر لی۔ ہوٹل سے باہر نکل کر لمبے لمبے میٹھے پاں تھا کہ نواز بھاگ بھاگ آیا۔
 اس نے کبل اٹھا کر کہا تھا جسے میں پریشانی میں بھول گیا تھا، تمہارا رفیق سفر! اس نے کبل
 میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کبل لے لیا اور تاگو چل پڑا، جب تک اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا
 وہ وہیں سوئی میں کھڑا رہا۔

گھر پہنچا۔ تو آبائی کی طبیعت کافی خراب ہو چکی تھی اور انیس سپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔
 میں مزید چھٹیوں کے لئے عربی ہسپتالہا اور اسی طرح پندرہ روزہ بیت گئے۔ اس کے بعد آبائی
 سنبھل گئے اور میں گھر سے نکل پڑا۔

رضیہ نے سرخ کار کیا تھا اور دونوں ہاتھوں کی پتھیلیاں اس کے رخساروں سے مس کر رہی
 تھیں۔ فیروز نے بات آگے بڑھائی، ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا، میری عدم موجودگی میں نواز احمد

کے والد کا تباہ و کراچی ہو گیا ہے اور وہ گھر کے لوگوں کے ساتھ وہاں چلا گیا ہے۔ اس کے خط کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا خط ملا جس میں اس نے یہ اطلاع دی کہ شاید انیس تک سے باہر جانا پڑے اور یہ اس کا آخری خط تھا؟

رضیہ نے اپنے شوہر کے اضطراب سے اندازہ لگا لیا کہ اس کا اندرونی یہ جان جو کسی حد تک دب گیا تھا، پھر نمودار کیا ہے۔ وہ اٹھا اور کمرے میں بیٹھنے لگا۔ رضیہ اسے کبھی کبھی کے قریب آئے اور پھر اس سے دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد رضیہ اپنی کمری کے پاس آکر ٹھہر گیا اور دیکھ بھری آواز میں بولا، وقت گزرتا گیا اور مجھے اس کی کوئی خبر نہ لی۔ رضیہ! میں اس کا کبیل لے آیا تھا اور اسے واپس کرنا چاہتا تھا۔ دنیا میں جو بھی اسس واسطے کو سنے گا وہ یہی کہے گا کہ یہ بات نہایت معمولی قسم کی ہے۔ میرا دوست اس بے کار، پرانے فرسودہ کبیل کو کیا کرے گا، لیکن میرے دل میں ایک تجھن ہے۔ میں اسے اپنے دوست کی لمانت سمجھتا رہا ہوں اور بدستور سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ لمانت واپس کر دینی چاہیئے۔ اسی لئے اسے اپنے کپڑوں کے ساتھ حفاظت سے دیکھ چھڑا تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ جب میں یہ لمانت لوٹا دوں گا۔ اور یہ خط؟ رضیہ نے سوال کیا۔

یہ خط! بتانا ہوں۔ میں کبھی کبھی کچھ دوستوں کو خط لکھ کر نواز کے دارے میں پوچھتا رہتا تھا، سوائے ایک کے سب نے جواب دیا تھا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ تک جمود گیا ہے۔ کہاں۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس شخص نے جس کا نام اعطاف امجد ہے۔ کبھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا تھا کہ اب چار پانچ سال بعد چانک اس کا خط آ گیا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ نواز جو کبھی نواز احمد تھا، آج شیخ نواز احمد کے نام سے داؤد پٹلی میں مقیم ہے۔ اگر نعمت کنڑ کیڑ ہے اور بیت خوشالی کی زندگی گزار رہا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو، اب میں اس کی لمانت لوٹا سکتا ہوں، لیکن۔۔۔

رضیہ مضطرب کھائی دینے لگی تھی، آپ نے کبھی مجھے یہ بات بتائی تھی؟

رضیہ کا سوال معقول تھا اور رضیہ کو اس کا جواب دینے میں دقت ہو رہی تھی؟ ابھی میں نے تو بس یہ سوچا تھا کہ امانت محفوظ ہے؟

• لیکن بتانے بغیر کیسے محفوظ رہ سکتی تھی؟ رضیہ نے کہا۔

• میٹر جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا۔ اب بتاؤ کہ کیا کیا جانے جس طرح بھی ہو، چراغ بجی رہا ہے وہ کبیل واپس لے لو؟

ضیمر نے یہ کہنے کے بعد اس کا رد عمل اپنی بیوی کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی اور رد عمل اس کی توقع کے خلاف تھا۔

• آپ خود سوچئے کیا یہ کوئی مناسب بات ہوگی؟ بوڑھیا کیا کہے گی؟ جس طرح آپ سوچ رہے ہیں، دوسرے نہیں سوچ سکتے، اس چیز کو مت بھولئے کہ وہ تو کرائی ہے اور میں اسے کبیل واپس لے لگی ہوں۔

ضیمر کے اندر وہ جھنجھلاہٹ جو دب سی گئی تھی، پھر پیدا ہو گئی۔ اچھا، امانت مانگو، میں خود مانگ لوں گا، اسے نیا کبیل مل جائے، تو پرانا کبیل لٹالے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے، بلکہ وہ تو خوش ہو جائے گی؟

رضیہ نے اپنی اندرونی کشمکش پر قابو پایا تھا، سو جائیے جا کر، وہ بولی۔

• سو جاؤں؟

ہاں آپ جو کچھ چاہتے ہیں، ہو جائے گا، یہ کہہ کر رضیہ سڑھیوں کی طرف ہلنے لگی چند منٹ کے بعد ضیمر بھی نیچے اترنے لگا۔

بلک جالے سے میٹر ضیمر نے بیوی کو تاکید کر دی کہ چراغ بجی جب آئے تو سب سے پہلے اس سے کبیل واپس لینے کی کوشش کرنا اور اسے معقول رقم دے دینا۔ رضیہ نے اقرار کیا، بڑھیا ورنہ اس دقت آ جاتی تھی، جب ضیمر اور اہل خانہ یا تو ناشہ کر چکے ہوتے تھے یا کہ وہ بے ہوش

تھے، لیکن اس نوزاد دیر سے آئی۔

”ااں! رضیہ نے اسے مخاطب کیا اور چراغ بی بی نے سمجھا کہ اس کی ماگن دیر سے آئے کی وجہ پوچھ رہی ہے۔ بولی نور سارا رات بیمار ہو گیا تھا، ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی؟“

”ااں! میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

چراغ بی بی پریشان ہو گئی اور اس کے سامنے کھڑی رہی۔

”بیٹھو ااں! ایک بات کرنی ہے تم سے؟“

چراغ بی بی بیٹھ گئی، تو رضیہ نے اپنے پر س میں سے دس دس کے پانچ نوٹ نکالے اور انہیں اس کی دائیں ہاتھ کی کبھی کے پاس رکھ دیا، یہ کہنی اس کے میز پر رکھی تھی۔

”بات بہت سہل ہے۔ میں نے تمہیں ایک کبل دیا تھا۔ ااں! یاد ہے نا؟“
 ٹھہرا نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

”اس کی جگہ یہ روپے لے لو ان سے نیا کبل خریدا جاسکتا ہے۔ اس سے بہتر اور اچھا۔“
 بڑھیا شاید کچھ سمجھ نہیں سکی تھی یا سمجھتی تھی کہ وہ اپنی ماگن کی بات خور سے نہیں سن سکی۔
 وہ کبل اصل میں کسی کی ضمانت تھی جو صاحب کو واپس کرنا تھی مجھے اس کا پتہ نہیں تھا لے آئی ہو گھر سے؟ روپے لے لو؟

بڑھیا نے روپے نہیں اٹھائے، بولی اُبی بی: میں کیا کروں مجھے کیا خبر تھی کہ یہ کسی کی ضمانت ہے؟“

”تو کیا کیا ہے تم نے اس کا؟“

”کرنا کیا تھا بی بی! پتہ ہوتا تو نہ دیتی یہ بھلی جسرات کو میرا چھوٹا بھائی بوسٹ آیا تھا۔ میں نے اسے دے دیا۔“

رضیہ کرسی سے اٹھ بیٹھی، اسے کچھ کہنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے چراغ بی بی کہنے لگی: اس کے جہلم میں دکان ہے تین سو روپے ۲۰ روپے بیٹھو آج ہے، سو روپوں کے دن

”جی۔ میں نے کہا یوسف! یہ کیل بی بی نے مجھے دیا ہے، تم لے لو۔“
 ”نورم نے اپنے بھائی کو دے دیا ہے، رضیہ کے لیے میں بے تابی نمایاں تھی۔“
 ”بی بی تم لے مجھے دے دیا تھا؟“

رضیہ سمجھ گئی کہ اناں کیا کہتا چاہتی ہے۔ یہ کہنا چاہتی ہے کہ جب تم نے کیل دے دیا تو وہ
 میری چیز تھی جسے چاہتی دے دیتی۔

چند منٹ کے بعد ہی ضمیر نے ٹیلیفون کیا اور جب رضیہ نے اسے بتا دیا کہ وہ تو جہلم کے
 ایک دکاندار کے پاس ہے تو اس نے کہا اناں سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھ لو۔
 رضیہ ٹیلیفون بند ہونے کے بعد بھی رسیور ہاتھ میں لئے میز کے پاس کھڑی رہی۔ اسے یہ
 بات بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی کہ ملازم سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھے مگر اس سے قبل وہ اس
 لیا جائے۔

پچاس کے نوٹ وہیں پڑے تھے۔ اناں نے اٹھائے نہیں تھے۔ نوٹ دیکھ کر اس کے
 اندر اپنی توہین کا احساس ابھرتا ملازم سے اس معاملے میں ایک لفظ تک نہ کہا اور نوٹ
 واپس اپنے ہوس میں رکھ لئے۔

جس وقت اناں منول کے مطابق جانے لگی تو اس نے دو تین بار میز کی طرف دیکھا۔ رضیہ
 نے اسے کٹھینوں سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں اور اناں چلی گئی۔ رضیہ بچوں سے باتیں کرنے میں
 مشغول ہو گئی۔

ضمیر ساڑھے سات بجے گھر آگیا اور کپڑے جھول کے بیغراس نے پوچھا،
 ”کیسے یہ اناں جھوٹ تو نہیں بول رہی؟“
 ”مجھے کیا خبر؟ رضیہ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

یہ غلط ضمیر کو چھپے اور اس کی بینائی پر شکن پڑ گئی؟ ٹھیک طور پر اس سے پوچھا جڑنا۔
 ”تو کیا میں نے غلط طور پر پوچھا تھا؟“

ضمیر نے بیوی کے رویے کا کچھ زیادہ خیال نہ کیا بولا "میرا مطلب ہے اسے پیسے دے دیئے جوتے ؟"

"دیئے تھے، لیکن اس نے کبل اپنے بھائی کو دے دیا ہے۔ جھوٹ لہانے کی اسے عزت کیا تھی ؛ پچاس روپے مل رہے تھے۔ وہ پرانا کبل تو کوئی پانچ روپے میں بیگا نہ خریدے۔ یہ تو درست کہا ہے قسم نے اس کے بھائی کا پتہ کیا ہے ؟"

آب جہلم جانش گئے ؟

"ظاہر ہے وہ کبل دینے کے لئے کرایہ خرچ کر کے لاہور نہیں آئے گا۔"

رضیہ باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔

ضمیر بولا "میں ابھی کھانا نہیں کھلاؤں گا۔"

رہ جاتے جاتے رک گئی۔ اپنی تو بہن کا وہ احساس جو دب گیا تھا، یکایک ایک چنگاری بن گیا، تنک کر بولی "کیا آپ کو اس کا خیال نہیں آتا کہ ایک پرانا، فرسودہ، سیلا کچیلنا، بھورہ کبل واپس لینے کے لئے آپ جہلم جانش گئے — ایک بہت معمولی دکاندار کی دکان پر ضمیر خاموش رہا۔

"کیا کہیں گے، آپ اس سے، خدا را کچھ تو سوچئے ! سوچئے کیوں نہیں آپ ؟"

رضیہ نے ایک ہی سانس میں یہ سارے الفاظ کہہ دیئے۔

ضمیر کا رویہ ابھی تک بدلا نہیں تھا۔ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے گویا ہوا پتہ پوچھ رہا تھا "نہیں"

"نہیں — تم نے پتہ نہیں پوچھا — میں نے تاکید کی تھی — اب ضمیر فرمودہ

ہو گیا تھا۔

"آخر کیا کہتی اس سے ؟"

"اس کے بھائی کا پتہ پوچھتیں اور کیا کہتی ؟"

”اگر آپ کو اتنا ہی خیال ہے تو ایک قیمتی کپیل خرید کر اپنے دوست کو دے دیں؟“
 ضمیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا: ”کیا بے سنی اور بے کار بات کرتی ہو۔ میں امانت واپس
 کرنا چاہتا ہوں اور تم مجھے قیمتی کپیل خریدنے کا مشورہ دے رہی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے انان
 جرائع لی بل سے اس کے بھائی کا پتہ کیوں نہیں پوچھا؟“

رضیہ جس کا یہ حال تھا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو، آہستہ آہستہ کمرے
 سے باہر نکلنے لگی۔ منیر نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا: جواب دے کر جاؤ!
 ”میں نے پتہ نہیں پوچھا، رضیہ نے جانتے جانتے کہہ دیا۔“

بچے باپ کی بلند آواز سے جاگ اٹھے تھے اور خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے
 ضمیر نے ایک لمحے کے لئے انہیں دیکھا اور جلدی سے باہر چلا گیا۔

رضیہ کورات کے وقت شوہر کے آنے کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ وہ تنہا روتے روتے سو گئی تھی
 صبح جب بیدار ہوئی، تو ضمیر کا ہنگ خالی تھا۔ اس نے باہر آکر دیکھا گیراج میں گاڑی بھی نہیں
 تھی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ ”اللہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے میرے اللہ! وہ نئی منت
 والوں کے گذرے ہوئے سرو چھوٹوں میں کھڑی رہی اور پھر سوچ کر کہ بچے باہر نہ آجائیں۔
 اندر چلی گئی۔“

سورج نکل چکا تھا۔ گرامس کی حرارت میں، جی شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جہلم کے ایک
 بازار میں ضمیر کی کار ایک معمولی سی دکان کے سامنے راک گئی۔

بازار کی کچھ دکانیں کھل چکی تھیں اور کچھ ابھی بند تھیں اور وہ دکان جس کے قریب منیر کی
 کار کھڑی تھی، ابھی بند تھی۔ منیر گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اور اس بند دکان کو غور سے دیکھ رہا
 تھا۔ چند منٹ اور گزرے ہوں گے کہ اوپر عمر کا ایک شخص میلے کپیلے پہلوں میں مبوس دکان پر آیا
 اور دکان کھولنے لگا۔ منیر اسے ٹھٹھکی باز دھک دیکھ رہا تھا۔ جب دکان کے دونوں پت کھل گئے اور
 دکاندار دکان کے اندر جا کر جھانڈو سے آیا، تو یکایک اس کی نگاہ منیر پر پڑ گئی اور جلدی سے بولا:

”باڈی آپ؟ وہ غلطی سے نیچے اتر گیا۔“

”اس کی بات چراغ بی بی کے جہان ہو؟“

دکاندار کے دُشے پھیل گئے: ”جی۔ جی۔ کیا برا میری بہن کو؟ اس نے جیسے سانس

رودک کر پوچھا۔“

”کچھ نہیں ہوا بہن! یوسف ہونا تم؟“

”جی، جی، فرمائیے جی، میری بہن نے بھیجا ہے نا آپ کو؟ اللہ خیر کرے:“

ضمیر اس کا ہاتھ کچڑ کر ایک طرف لے گیا: ”تم مجھے جانتے ہو۔“

”جی ہاں، آپ کو یاد نہیں رہا، ایک دفعہ بہن سے ملے آپ کے گھر گیا تھا؟“

اچھا تو سنو! وہ کہل کر تباہی بہن نے تم کو دیکھا۔ اصل میں کسی کی امانت تھا۔ میری

بیوی یہ بات نہیں جانتی تھی، اس نے چراغ بی بی کو دے دیا۔ تم جانتے ہو امانت۔ امانت

ہوتی ہے۔ جانتے ہو نا، کیوں یوسف؟“

”جی۔ جی جاتا ہوں جی، یوسف نے جواب دیا۔“

”تم اس کی جگہ کیا کہل خریدو؟ یہ تو! ضمیر نے جیب سے دس دس کے کئی نوٹ نکال کر اس

کی طرف بڑھا دیئے یوسف لے دو تین لمحے توقف کیا، پھر نوٹ لے لئے اور انہیں کرتے کی جیب

میں رکھتے ہوئے بولا: ”وہ گھر میں ہے جی؟“

مجھے جلد واپس جانا ہے، تکلیف کر سکو تو بڑی مہربانی ہوگی:“

یوسف نے ساتھ والی دکان کی طرف دیکھا، دکان ابھی کھلی نہیں تھی۔

”یہ آج لے تو جاؤں گا جی؟ یہ کہہ کر دکاندار صفائی میں مصروف ہو گیا۔“

ضمیر کھڑا رہا، اتنے میں ساتھ والی دکان کا مالک آ گیا۔ یوسف بولا:

”حسن یار! یہ باڈی آنے میں ہیں تھوڑی دیر لگے گی ہیں، بس ابھی آیا؟“

حسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”گھر دور ہے یا نزدیک؟ ضمیر نے پوچھا۔

”نزدیک ہی ہے جی۔ بس پہنچنے کے پہنچنے۔ وہ دکان سے اتر کر ایک طرف مدنا ہو گیا۔
ضمیر یوسف کے ساتھ چلتے نگا۔ آدھ فرلانگ کے بعد ایک معمولی سے یک منزل مکان کے سامنے
رک گیا اور بہت اپنائیت سے بولا: ”میں دروازہ کھولتا ہوں؟“
”نہیں! بھئی۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ بیگ میں میرا انتظار ہو رہا ہے؟“
”اچھا جی۔ کہہ کر یوسف اندر چلا گیا۔

ضمیر گی کی کڑ پر تنہا کھڑا تھا۔ اصرے جو بھی گزرتا تھا اسے حیرت سے عبور دیکھتا۔
اس قسم کا تجربہ اس سے پہلے اسے کبھی نہیں ہوا تھا وہ اپنے اندر ایک ایسی الجھن محسوس کر رہا تھا
جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

کئی منٹ گزر گئے۔ پھر اندر سے ایک مردانہ اور ایک زنانہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان کو دھڑکا
سے غصہ اور زبردستی کی آواز کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس پر کچھ لوگ تماشہ دیکھنے کھینے مکان کے دروازے
کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”کیا بات ہے؟“ باڑھی: ایک شخص نے پوچھا۔

”جیسے کیا خبر؟“ ضمیر نے بڑا ہر کر جواب دیا۔

اس شخص کی نظریں پڑ چھ رہی تھیں تو تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔

آدھ گھنٹے کے بعد یوسف باہر آ گیا اور نام سا ہر کر بولا: ”باڑھی! کمال ہو گیا ہے؟“

ضمیر کے ساتھ اور بھی لوگ جو وہاں ٹھہر گئے تھے، یوسف کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

”آؤ باڑھی! یوسف نے ضمیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا: ”باڑھی! کیا ہے؟“

ضمیر نے پوچھا۔

”میری نامہ لادہری نے کھل اپنے بھانجے کو دے دیا ہے۔ رات وہ آیا تھا مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔

”تو اب؟“

’بازجی یہ اتول نمبر چار ایسا ہے۔ گھر پر نہیں پہنچا۔ میں اس کے دو تین ٹھکانے جانتا ہوں۔ مل جانے گا بازجی۔ گھبراؤ نہیں۔ جانے گا کہاں کبیل لے کر؟‘

’ٹوڑا گھنٹا تک یوسف ضمیر کو گلیوں میں لئے لئے پھرا۔ کئی دکانداروں سے اس کے بارے میں پوچھا کسی نے کہا صبح اس نے بیلے کی دکان سے نئی پی تھی کسی نے اطلاع دی وہ کچھ دیر پہلے یس سے گزرا تھا۔ یوسف ضمیر کو اس کے گھر پر بھی لے گیا، مگر بے سود۔

دو پہر ہونے والی تھی اور ضمیر چل چل کر خشک گیا تھا۔ اسے یہ ٹکڑی تاریکی تھی کہ وہ بک سے ہو کر نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں دہاں کیا سائل درمیش ہوں۔ بالآخر یوسف اسے واپس اپنی دکان پر لے آیا اور دہاں آکر بولا ’بازجی! آپ کو کبیل چاہیئے نا؟‘
’تو اور کس کام کے لئے وقت ضائع کر رہا ہوں؟ ضمیر نے فستے سے کہا۔

’بل جانے گا آج شام نہیں، تو کل کسی وقت ضرور آجاؤں گا۔ گھبراؤ نہیں بازجی!‘
ضمیر اچھا کہہ کر اور اسے فوراً کبیل پہنچانے کی تاکید کے ساتھ کرائے کے لئے یس روپے دے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چھوٹی وہ بڑی بے دلی سے چلا رہا تھا وہ میدان تک ہی میں پہنچا۔
میلے سے پریشان دیکھا، تو سردکن کسی قدر پریشان ہو گیا۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ گرد آلود اور آنکھوں میں بالوں کی سائے سے لہراتے ہوئے اس کی ایسی حالت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ہر شخص خیر فرمے، کے استاد کے ساتھ اس کے پاس آئے دکھا۔

’کون سی ایسی بات نہیں، ایک مسئلہ ہے۔ حل ہو جائے گا۔ وہ ہر پہچنے والے کو قریب قریب یہی جواب دیتا۔

شام کے وقت جب گھر آیا، تو اس کی بیوی اور بچے صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اس کی ہنست کڈائی دیکھ کر ہر فرد خوفزدہ ہو گیا اس نے بچوں سے دیکھی انداز میں حال چال پوچھا اور اوپر چلا گیا۔ ساتھ ہی رضیہ پر آگئی، بولی، کہاں چلے گئے تھے آپ؟‘
’تم نہیں جانتیں؟‘

”جانتی ہوں، لیکن کم از کم اطلاع دے کر تو جانتے، کیا بنا، کیا ہوا؟“

ضمیر نے غصے سے کہا کہ اس کی بیوی جس نے اس کا بیترہ برس ساتھ دیا تھا اور جس کا اس پر سب سے زیادہ حق تھا، ایک گھری بے اعتمادی کی کیفیت میں گرفتار ہے۔ اس کے جیسے پردہ خاں ابی نہیں ہو ایک لمبی رفاقت اپنے ساتھ لاتی ہے۔ سوچنے لگا کیا وہ اس سے بدظن ہو گئی ہے کیا اس کے ذہن میں بدگمانیاں بڑھ رہی ہیں۔

”کیا بنا؟۔۔۔ کیا ہوا؟“ یہ الفاظ جیسے رضیہ کی پیشانی پر چپاں ہو کر وہ گئے تھے اور مسلسل سگ رہے تھے ضمیر نے کوشش کی کہ اس راستے کی ٹنگنی یا جو ریت کر بہت حد تک کم کر دے چنانچہ کہنے لگا ”اناں چراغ نبی کا بجانی لے آئے گا۔“

”کیبل لایا یہ الفاظ رضیہ نے ایسے ہیے میں کہے تھے کہ ہڑکی کڑواہٹ ضمیر غصے سے بھر نہ رہ سکا۔ جگڑ کر بولا، اناں کیبل؟“

”شکر ہے خدا کا۔ ہمیں ایک بھاری مصیبت سے نجات ملے گی۔ کھانا لگا، بار بار ہے۔“

آئے؟

”آتا ہوں، ضمیر نے کہا۔ اسے اپنے کمرے میں کوئی کام نہیں تھا، مگر وہ بیوی کے ساتھ بچے اترنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکا، شاید رضیہ پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس نے اس کے آخری فقرے کا بہت بڑا مانا ہے۔“

کھانا قریب قریب خاموشی کے عالم میں کھایا گیا۔ رضیہ نے نہ اس سے پوچھا کہ جہاں وہ گیا تھا وہاں اس پر کیا برتی اور نہ ضمیر نے خود اسے کچھ بتایا یا بچے باپ کو تکبیروں سے دیکھتے رہے اور کھانا کھاتے رہے۔

یوسف نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوسرے روز ہی کیبل لے کر لاہور آجائے گا، مگر تین روز گزر گئے اور وہ نہ آیا۔ رضیہ نے اپنے شوہر کی برصغری ہوئی پریشانی کا اندازہ لگا لیا اور انہیں کو کہہ کر اس کے بھائی کے پاس بھیج دیا۔ ضمیر کو اس کاظم نہیں ہوا۔

چوتھے روز وہ بنگ جلنے کے لئے پکڑے بدل کر بیٹھ گیا، تو رضیہ نے اسے دیکھ کر اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ بولی: "اُمّاں آج نہیں تو کل ضرور آجائے گی۔"
 "تم نے اسے بھیجا ہے؟"

"کیا کرتی؟ میں نے اسے بڑی تاکید کی تھی کہ ہر حال میں کل شام بنگ آجائے۔ آج ضرور آجائے گی۔"

ثانیہ وہ —! ضمیر کے لمبے میں تذبذب تھا۔

"آپ کی امانت آپ کو مل جائے گی۔ یہی چاہتے ہیں نا آپ؟"
 ضمیر نے اپنی بیوی کے فقرے کی خیریت محسوس کر لی۔ تلخ لہجے میں بولا: "رضیہ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔"

"مجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ رضیہ نے دو ٹوک جواب دے دیا۔

ضمیر نے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔ باہر نکل کر گاڑی ٹارٹ کرنے لگا۔

بنگ میں کام کرتے وقت ضمیر کے ذہن میں بار بار یہ سوال چٹھنے لگتا تھا کہ اُمّاں کیلئے آئے گی یا نہیں۔ یوسف نے کہا تھا کہ اس کی بیوی کا بھانجا جواری ہے اور جواری سے ہر قسم کی توقع کی جاسکتی ہے۔

○

منگل کی صبح تھی۔ اُمّاں چراغ بنی بی کو جہلم گئے چار روڈ گزر چکے تھے۔

اب بنگ تو اسے ہر حال میں آجانا چاہیے تھا! ضمیر نے ناشہ کرتے وقت کئی بار سوچا۔ رضیہ بچوں کو ناشہ کروا کر سکول کے لئے تیار کر رہی تھی۔ ضمیر بنگ میں جلدی پہنچ جاتا تھا۔ اس نے بچوں کو گاڑی میں بٹھایا اور انہیں دن کے سکولوں تک پہنچا کر خود بنگ چلا گیا۔ بارہ بجے تک کام کا اس قدر حجم رہا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی فراغت نہ پاسکا۔ ساڑھے

بارہ بجے روزمرہ کے معمولات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تو اس نے گھڑوں کیا اور اس سے یہ مشرکہ وہ کچھ کہے رضیہ کی آواز آئی اُمّاں آگئی ہے! اور یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

”رضیہ نے پہلے کبھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا تھا؛ آج کل اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے سوچا اور
گھر جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

”کہاں ہے اماں؟ اس نے گھر پہنچتے ہی بیوی کو مخاطب کیا۔

”اوپر۔ رضیہ کا بہت مختصر جواب تھا۔

”اٹاں اوپر ہے؟“

”نہیں۔ رضیہ پڑے گی کہ دعویٰ کو دے رہی تھی وہ اپنے کام میں بڑی طرح مصروف تھی۔

ضمیر اوپر چلا گیا میز کے اوپر خاک رنگ کے کاغذ میں بیٹی ہوئی کوئی چیز پڑی تھی۔

”تو گورا وہ کب لے آئی ہے؟ اور اس نے بھلتا نام کاغذ الگ کر دیا، ایک خوشی کبیل

اس کے ہاتھوں میں تھا۔ ایک دم اس کے دل دوبارہ اس میں سونیاں سی جھپٹنے لگیں، رضیہ! وہ گرا

اور ساتھ ہی وہ اندر سے اس سے رضیہ داخل ہو گئی بولی دھینچنے ست آگئی ہوں فرما ہے۔

”میرے ساتھ یہ مذاق۔۔۔ ایہ وہ کبیل ہے جو تم نے آٹاں کو دیا تھا؟“

”نہیں۔“

پھر یہ کیا ہے؟

آپ دیکھ نہیں رہے کبیل ہے۔ وہ کبیل اماں نہیں دیتی۔ دیکھتی بھی نہیں۔ میں ایک بڑی

عجبت سے عجبات پاسے کے لئے یہ کبیل بازار سے لے آئی ہوں۔

”رضیہ! ضمیر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانوں کو اس طرح تیشی دی کہ اس کا

ہلک پیلا پڑ گیا اور جب اس نے ہاتھ مٹائے تو وہ ڈانگٹانے لگی۔

”میرے ساتھ یہ مذاق!۔۔۔ غم تو نہیں آئی؟“ وہ سوچا، بھی اور پچی آواز میں گرجا۔

رضیہ چپ چاپ کھڑی رہی اور پھر اس انداز سے جھوٹ جھوٹ کر دے لگی کہ اس کا سارا

جسم کانپنے لگا، یہی کیا کرتی؟ آپ نے گھر کو جسم بنا دیا ہے۔ سارا اطمینان تباہ کر دیا ہے؟

”مگر اس حرکت کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ بھی لڑا بابا سکنا ہے؟“

”یہ امانت نہیں ہے؟“

”اس سے تو بہتر رہی ہے؟“

”رضید! ضمیر نے ایک بار بھراپنے ہاتھ اس کے شانوں کی طرف بڑھائے، رضید جھٹ پکچھے ہٹ گئی، مگر دوسرے ہی لمحے اس کے قریب آگئی، جھٹلا کر بول،

”شانوں کی طرف نہیں، گردن کی طرف ہاتھ بڑھائیے۔ میں حاضر ہوں۔“

ضمیر نے اسے شطہ ہار نظروں سے دیکھا، کبیل ندر سے دیوار پر دسے مادا اور کھٹ کھٹ بننے آتر گیا۔

وہ سرکک پر چلے جا رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے؛ ایک زہر آلود لہر بار بار اس کے دل و دماغ میں سے گزر جاتی تھی اور اپنے پیچھے اپنا اثر چھوڑ جاتی تھی۔

پندرہ برس منٹ، بعد ضمیر کی کاہلہم کی طرف چلی جا رہی تھی، ایک کدہ سے اس کا انصاف ہوتے ہوتے بچا، ایک ٹوک سے بھی یہی حادثہ پیش آنے والا تھا کہ خوش قسمتی سے ٹوک کے ٹڈا نیور نے سپیڈ پر یک لخت کنٹرول کر لیا اور ضمیر کے اٹاڑی پن کو گئی لمحے کو ستارہ۔

یوسف اپنی دکان پر موجود نہیں تھا، ایک اور شخص اس کی جگہ گاڑیوں سے پیٹ رہا تھا، ”یوسف کہاں ہے؟“ ضمیر نے پوچھا۔

”وہ بیمار ہے، گھر پر ہے۔“

ضمیر اس کا گھر دیکھ چکا تھا، گاڑی کو منتقل کیا اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر آواز دی، تو ایک عورت نے دروازے پر آکر پوچھا، ”کون ہے؟“

”یوسف سے کہہ دو، لاہور سے ضمیر باہر آیا ہے؟“

عورت اسے اندھے گئی، یوسف چارپائی پر بٹا ہوا تھا، یہی گفتگو کے بعد ضمیر نے اس سے کبیل کے بارے میں دریافت کیا۔

”باؤ میں کیا کروں؛ بکبر کا بچہ بتا رہی نہیں کہ کہاں رکھنا ہے۔ باؤ بڑا جوارا ہے۔“

یوسف کے منہ سے یہ غلط نکلے ہی تھے کہ اس کی بیوی کو جیسے آگ لگ گئی، جوارا ہے تو اپنے گھر ہے، تہہ دار کچھ لے تو نہیں گیا، جوارا ہے، جوارا ہے۔ میں کہے دیتی ہوں آدمی کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔“

یوسف اٹھ بیٹھا، خیر کو خد شہ خدا کہ یہاں ایک نیا ہنگامہ برپا ہو جائے گا، اس نے یوسف کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ذرا باہر چلو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

اس طرح وہ ہنگامہ تو ٹلی گی، لیکن اب بھی ضمیر بدستور پریشان تھا۔

”باؤ جی! وہ مل جائے تو اس کا کچھ مر لکھال دوں گا، تم نے کیوں تکلیف کی؟۔۔۔ میں کبھی شہر میں بیٹھا دوں گا۔“

”یوسف! یہ بتاؤ تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟ ضمیر نے اس سے پوچھا۔“

”ہے باؤ جی۔“

ضمیر صبح میں پڑ گیا، اس نے حسیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا۔ یہ لو پھل وال کھا لینا؟ ہاتھ میں نوٹ لے کر یوسف کی آنکھیں چمک اٹھیں، باؤ جی! اتنی دور سے آئے ہو، موٹر کار کہاں ہے؟

”تہہ داری مکان کے پاس۔“

”باؤ جی! اکبر کا گھر کافی دور ہے۔“

”تو تانگے میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ ضمیر نے کہا۔ یوسف نے دھماکے کی غماز کی اور وہ تانگے میں بیٹھ گئے۔ بہون گھنٹے کے بعد کہیں تانگی ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رکھا۔ یوسف جلدی سے اتر ا اور اس مکان کے اندر چلا گیا، کئی منٹ کے بعد باہر آ کر اس نے بتایا: وہ گھر میں ہے نہیں۔ کسل سکا نہیں ہے، رچ کھا ہے اس نے۔۔۔ پکا جوارا ہے باؤ جی! میرا سے تلاش کرتے ہیں، آئیے!“

تا نگہ ایک گھنٹے تک مختلف مقامات پر نگہ رہا تاخود ہی مودہ والے کی دکان پر رکھا، تو یوسف چلا گیا، مگر نیچے اترا اور اس نے بیچ پر بیٹھ بیٹھنے لگا۔ پچھلے پرانے کپڑوں میں جو کس ایک فوجیان کو پکڑ لیا، ضمیر نے مجھ لیا کہ یہی اکبر ہے۔ اس نے مانگے سے اتر کر یوسف کو اشارہ کیا کہ اسے چھو دو، یوسف کی گرفت کبھی پڑ گئی، تو وہ اس کے قریب گیا اور بہت دیر سے بولا: اکبر! مجھے اس کبل کی بڑی ضرورت ہے۔ وہ لانت تھی میرے پاس — دے دو میرے بھائی؟

اکبر نے آنکھیں جھکا لیں، یوسف بولا: باڈا اس نے بیچ کھلایا ہے اس نے؟
تم چپ رہو یوسف! میں خود بات کر رہا ہوں — دیکھو اکبر! اگر ایسا ہے — کسی کو دے دیا ہے، تو میں اس کی دو گنی قیمت ادا کر دیتا ہوں۔ جتنی رقم چاہیے لے لو، ضمیر نے جیب سے پھر پر میں نکال لیا۔

”کچھ نہ دو باڈا۔“ یوسف نے مداخلت کی ضمیر نے خشناک نظروں سے اسے دیکھا اور وہ اپنا فقرہ مکمل ذکر رکھا۔

اور تو کوئی بات نہیں اکبر! یہ لانت ہے اور تم کو خبر ہے نا کہ لانت؟

اکبر نے سر ہلا کر کہا: میں جانتا ہوں۔ باڈا جی!

”تو یہ رقم رکھ لو — کب لاؤ گے؟“

اکبر دو تین لمحے خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا: پیسے پاس رکھیے میں نے جو کچھ لیا ہے، وہ اسے دے دوں گا۔ کبل آپ کو گھر پر پہنچ جائے گا؟

”جھوٹ بکتا ہے یہ کبل گھر پر پہنچائے گا۔“ یوسف یہ لفظ کہے بغیر زورہ رکھا۔

”یوسف! تم خاموش رہو؟ اور وہ اکبر کی طرف مڑا۔ اکبر! یہ لے لو۔“ بولو کب، لاؤ گے کبل؟

اکبر نے فوٹ لے لے کر یوسف جلدی سے بولا: باڈا قیامت تک کبل نہیں لے گا۔ مجھ سے کھسکا لو۔“

یوسف تم چپ نہیں ہو گے! ضمیر نے ڈانٹ بولی۔

”جناب! میں دن کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ کل پرسوں کیل خود لے کر آ جاؤں گا۔ مجھے آپ کا ہتہ معلوم ہے!“

ضمیر نے دیکھا کہ اکبر کے لفظوں سے غلامی مترشح تھا اور اسے یقین ہو رہا تھا کہ اکبر جھوٹ نہیں بول رہا۔

ضمیر نے گھر پہنچ کر پری سے کہا: ”رضیہ! کل وہاں پرسوں ایک شخص آئے گا۔ اپنا نام اکبر بتلے گا۔ میں ہنگ میں ہوں، تو فوراً خبر کر دینا!“

”اچھا! رضیہ کا جواب تھا۔“

”بیٹھو! بالکل نہیں!“

”اچھا!“

اکبر نے کہا تھا: پرسوں میں کیل لے آؤں گا، مگر تین دن بیت گئے تھے اور وہ نہیں آیا تھا۔ ضمیر کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ یوسف کے الفاظ ”میرت کے دنوں کی طرح اس کے دل و دماغ کو پھینے لگے تھے۔ سوچتا تھا: ”اس نے درست کہا تھا، یہ اکبر بڑا داری ہے اس نے روپیہ جوئے میں لے دیا ہو گا؟ اتنا کچھ کرنے اور وہ بیہ ضائع کرنے کے بعد بھی وہ اسی منزل پر تھا جس منزل پر اپنے ٹرنک میں کیل نہ ملنے پر تھا۔“

○

پانچویں روز صبح کے وقت چھینے کے سامنے کھڑا ٹیوکر رہا تھا کہ اس کا لڑکا اور پر کیا اور اسے اطلاع دی: ”آؤ! ایک آدمی آیا ہے!“

اکبر؟ اس نے اضطراب کے عالم میں بیٹے سے پوچھا، لیکن لڑکا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے جلدی جلدی ایڈر خداداں پر پھیرا، تو ایسے سے جبر، پونچھا اور نیچے چلا گیا۔

وہ دروازے پر اکبر کھڑا تھا جس نے اخبار کے کاغذ اس میں کوئی چیز چھپا رکھی تھی، ضمیر خوش ہو کر بولا: ”آئے آئے ہا!“

”کتابیں منہا لو! رضیہ نے بچوں کو حکم دیا اور بچے کڑاؤں پر جھک گئے، ضمیر و دانا سے ہم سے نکل رہا تھا۔“

○

ضمیر جب لگژری کوچ سے نیچے اترتا تو دھوپ پٹی پڑ چکی تھی، اس نے جیب سے الطاف احمد کا لفافہ نکالا اور اپنی منزل پر مقصود کا پتہ دیکھا۔

مری روڈ، ہنرول ہیپ سے کچھ آگے، کوٹھی کے باہر شیخ نواز احمد گورنمنٹ کونریکٹر: اس نے اضافہ کر کے ایک ٹیکسی ڈروائی، ڈرائیو کو پتہ بتایا اور ٹیکسی کے اندر بیٹھ گیا۔

ٹیکسی دار ہی تھی اور اس کے دل و دماغ پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کا تجربہ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کر رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ایک ایسا چہرہ دیکھ رہا تھا جس پر بیک وقت معصومیت بھی تھی، پیار بھی اور گہری ہمدردی بھی، اس چہرے پریشانی کے پیچھے جو آنکھیں چمکی چمکی می تھیں، ان سے ایک غلب، معصومانہ سکرامنٹ پھوٹ رہی تھی۔

یہ چہرہ اس کے روم میٹ نواز احمد کا اقتلہ وہ سوچنے لگا، اب نہ جانے اس کے چہرے میں کتنی تبدیلی آچکی ہوگی اور جب وہ مجھے اچانک دیکھے گا اور میں اسے کیل دکانوں کا جو ہماری خضر کو محبت کی یادگار ہے جو میرے پاس انکی امانت ہے، تو وہ کیا کرے گا، اس کی کیا حالت ہوگی۔ کس طرح بے تابانہ — مجھ سے چٹ جائے گا!

اس کا دل زور زور سے دھکنے لگا۔

ٹیکسی ایک جگہ پہنچ کر ٹوک گئی تھی، مگر ضمیر اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

نورا وہ سانسے شیخ صاحب کی کوٹھی ہے:

ضمیر ٹیکسی سے اترتا، ڈرائیو کو کرایہ ادا کیا اور ایک طرف جانے لگا۔

کوٹھی کے دروازے کے پہلو میں بنم پلیٹ پر ابھرے ہوئے لفظوں میں لکھا تھا: شیخ نواز احمد گورنمنٹ کونریکٹر۔

کمرے کے اندر سے نو اڑوں کا ایک طوفان باہر آ رہا تھا۔ ان تھانوں میں بلند قہقہے بھی تھے اور ہر تنوں کی کھٹکھٹاہٹ بھی۔ ایک شخص جو وضع قطع سے نوکر نظر آ رہا تھا، چائے دانی بنے اندر جا رہا تھا۔ ضمیر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ شیخ صاحب سے کہو، لاسور سے ضمیر خان کیا ہے؟

نوکر اندر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے باہر آ کر کہا: چلے جائے؟

ضمیر نے بیگٹ بائیں بھل سے نکال کر دائیں بھل میں داب لیا۔ اندر صوفوں اور کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہنس رہے تھے۔ چائے پی رہے تھے۔ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

شیخ نواز احمد: ضمیر نے دو واڑے پر ڈک کر کہا۔

ایک وقت کنی (تھو) ایک لمیم و شیم آدمی کی طرف اٹھے جو تنہا کچر پر بیٹھا تھا۔

کون صاحب: لمیم و شیم آدمی نے پوچھا۔

نواز احمد: آپ؟

جی فرمائیے؟

ضمیر نے حیرت سے گردش کے اس ڈھیر کی طرف دیکھا۔

میں ضمیر خاں ہوں؟

ضمیر خاں: اکون ضمیر خاں؟

شیخ صاحب کی آنکھوں سے اجنبیت جھلک رہی تھی۔

ضمیر خاں:۔۔۔! بدلاؤ بدشگونی میں ہم نے ڈیڑھ سال اکٹھے بسر کیا تھا۔ ایک ساتھ!

شیخ صاحب اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے تھے۔ خدا دیر تک کربوے، مسکن کیے۔۔۔ میں

خیر بتائیے کیسے آنا ہوا؟

ضمیر نے غصے سے کہا کہ برف کا ایک بھاری تودہ اس کے سر پر آگرا ہے۔ شیخ صاحب اسی

اڈاز سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ کو یاد ہو گا۔ اپنا کھل چھوڑ کر آپ چلے گئے تھے۔ یو میرے پاس رہ گیا تھا۔ آپ کی
لامنت تھا۔ آج۔۔۔“

ضیمر نے پکیٹ بٹل سے نکال کر کہا۔

”لاحول ولا۔۔۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ شیخ صاحب کی آنکھیں جیسے اس کی حالت
پر شکوہ ہی تھیں۔ غلام احمد صاحب سے لے کر“

اپنے ایک کا حکم ہی کر لو کہنے ضیمر نے پکیٹ لے لیا۔ ”نیکس مے نہیں؟“ شیخ صاحب نے
اکٹائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”جی نہیں شکریہ“ اور ضیمر ہنس اٹھا۔ اس کا تعاقب قہقروں نے کیا جو اندر بند ہو گئے تھے۔
”وہ آہستہ آہستہ چل گیا۔ کوئی سے ہاتھ لگایا۔ اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا اور
برف کے تودے لگا تار اس کے سر پر گر رہے تھے۔“

ساتواں چراغ

عمری ہو یا سردی، خٹان پہاڑی کی بندریوں سے سرو ہوائیں مسلسل نیچے اترتی رہتی تھیں۔ کبھی قہر پڑی ہو جھیل ہوتیں اور کبھی نسبتاً ہلکی۔ یہ ہوائیں جب بھی اس بے آب و گیاہ علاقے میں سے گزرتی تھیں تو کہیں بھی ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی تھیں کیونکہ کوئی دیوار، درختوں کی کوئی قطار ان کے راستے میں مائل نہیں ہو سکتی تھی۔ برابر آگے بڑھتی چلی جاتیں اور گو بابا صاحب کے مقبرے تک پہنچتے پہنچتے ان کی رفتار کبھی بھی نہ ختم ہو جاتی تھی تاہم جس وقت بھی وہ اس مقبرے کی وسیع دیواروں سے ٹکراتی تھیں تو دیکھنے والے کو خوراً یہ احساس ہو جاتا تھا کہ یہ دیواریں فی الفور زمین بوس ہو جائیں گی، مگر برسوں سے ہواؤں کا یہ عمل جاری تھا اور مقبرے کی یہ کمزور دیواریں پرستو اپنی اپنی جگہ پر کھڑی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں کہیں کہیں رخنے بڑھ گئے تھے اور ہواؤں کے جھونکے ان رخنوں میں سے گزر کر ٹوٹے پھوٹے مڑا کو چھوٹے ہوئے آگے نکل جاتے تھے۔

یہ بابا صاحب کون تھے؟ ان کی یہ ابدی قیام گاہ کب تعمیر ہوئی تھی اور ان دیواروں نے کب سڑا دیا تھا؟ ان باتوں کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

بابا صاحب کے مقبرے سے ڈیڑھ میل اندر جنوب کی جانب ایک پھوٹا سا گاؤں جی جی پود کے نام سے منور آباد تھا لیکن اس گاؤں کا بوڑھے سے بوڑھا آدمی بھی ان سوالوں کا جواب دینے سے ناام تھا۔

اس گاؤں کو آباد کرنے نصف صدی سے زیادہ مدت نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے یہاں پانی ہی پانی تھا۔ پھر جب اس پانی کو مصروف میں لانے کے لئے ایک قریبی نہر میں مسئلہ کروا دیا گیا

تو فعلی علاقہ صحیح کی تازت سے سوکھ کر اس قابل ہو گیا کہ یہاں لوگ کچے کچے مکان بنا سکیں اور ارد گرد دیہات میں رہنے والوں نے سیلوں پسیلی ہوئی اس زمین کو دیکھا جہاں وہ آسانی سے مکانات تعمیر کر سکتے تھے۔ کھیت بنا کر فصلیں اگھا کھتے تھے تو وہ ادھر آئے گئے اور چند ہی سال میں یہاں اچھی خامی آبادی ہو گئی۔

اس گاؤں کا نام جی جی پورہ کیسے پڑا؟ اس سلسلے میں گاؤں کے پرانے لوگ بتاتے تھے کہ جب ان میں سے کسی نے سب سے پہلا مکان بنایا تو یہاں ایک جھونپڑی میں ایک بوڑھا شخص رہتا تھا جو بالعموم نیم عریاں حالت میں دکھائی دیتا تھا۔

اس شخص نے بتایا کہ وہ بابا صاحب کا سرور خاص تھا۔ چنانچہ وہ دن کا سامرا وقت تو اپنی جھونپڑی ہی میں بسر کرتا تھا اور پیلے ہی شام کی تاریکی فضاؤں میں پھیلے لگتی تھی۔ بابا صاحب کے مزار پر چلے جاتا تھا اور تمام رات وہیں گزار دیتا تھا۔

بابا صاحب کو ملنے والے لوگ مزار پر کچھ نہ کچھ نیاز چڑھاتے رہتے تھے۔ یہ شخص اس میں سے حقوذاً حصہ وصول کر کے باقی زائرن ہی میں بانٹ دیتا تھا اور یوں اس کے بے نقوت یا موت کا سامان مہیا ہو جاتا تھا۔

گاؤں کا نام اسی شخص کی نسبت سے مشہور ہوا تھا۔ اس کا مشق یا پیدائشی نام کیا تھا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اور نہ وہ کسی کو اپنے بارے میں معلومات بھی پہنچانے کا خواہش مند ہی تھا اصل معاملہ یہ تھا کہ وہ ہر دوسرے فقرے پر جی جی کہتا تھا یوں کہنا چاہیے کہ جی جی اس کا ٹکڑے کلام تھا۔ اس کے پاس عقیدت سے آنے والوں نے اسے بار بار جی جی کہتے سنا تو اس کا نام ہی جی جی میاں دینے لگے اور اس طرح یہ گاؤں جی جی پورہ مشہور ہو گیا۔

گاؤں والے جی جی میاں کا بہت احترام کرتے تھے اور جو کچھ وہ کہتا تھا اسے صحیح تسلیم کر لیتے تھے۔ اس جی جی میاں نے گاؤں کے خاص خاص لوگوں کو بتایا تھا کہ بابا صاحب بڑے ادب پختہ و سب کے بزرگ تھے۔ مگر طبیعت کے لحاظ سے تھے جلالی۔ بڑی جلدی جلال میں آجاتے تھے

اور بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بلا تکلف جھڑک دیتے تھے۔

شاید انہی جی جی میاں نے بتایا تھا اگر بابا صاب کے مزار پر ہر جمعرات کو مٹی کا ایک چراغ جلایا جائے تو ساتویں جمعرات کو جب آخری چراغ جلایا جائے گا تو چراغ جلانے والے کی دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔

چراغ جلایا جاتا تھا مگر ابھی اسے مزار پر رکھا ہی نہیں جاتا تھا کہ شمالی پہاڑوں کی طرف سے آنے والی سرد ہوائیں اسے بجھا دیتی تھیں۔ گھاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو گا جسے اس کا علم نہیں تھا اور جس کے دل میں یہ یقین جاگزیں نہیں تھا کہ ساتویں جمعرات کو چراغ جلانے والے کی آرزو مزور پوری ہو جاتی ہے لیکن شکل و رخی کو اس آزمائش پر پورا اتنا قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ اول تو یہی جمعرات ہی کو چراغ کی نو شمائی ہولناں کے چھ سے سیاہ پوش ہو جاتی تھی اور پہلے دو تین چراغ صبح سلاست مزار تک پہنچ بھی جاتے تھے تو ان کے بعد ہر چراغ جلایا جاتا تھا وہ مزور کچھ جاتا تھا۔ عام یقین یہ تھا کہ اب تک جو کوئی شخص بھی یکے بعد دیگرے سات چراغ جلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ بابا صاب کی جلالی طبیعت کی کار فرمائی ہے ورنہ شمالی پہاڑوں کی بلندیوں سے آنے والی سرد ہواؤں کا یہ کہاں حوصلہ کہ وہ عین اس لمحے دیوار کے روزنوں سے اندر آئیں جب مزار کے قریب ہر چراغ جلایا جا رہا ہو۔ یوں ساتواں چراغ جلانے کی کبھی قربت ہی نہیں آتی تھی البتہ بعض لوگوں کی زبان یہ بات سنی جاتی تھی کہ کافی مدت ہوئی ایک بار ایک دھوبن نے مزار پر ساتواں چراغ بھی جلا دیا تھا اور اس کی مراد بھی پوری ہو گئی تھی اس کا بیٹا جو قتل کے مقدمے میں ماخوذ تھا پچاسی کی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

اس حقیقت کی تصدیق اس وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ ماں اور بیٹا دونوں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

اگر کوئی شخص قبرے کے اندر جانے کی بجائے اس کے ارد گرد گھومتا تو اسے بے شمار ٹوٹے

ہوئے نئی کے چراغ نظر آجاتے۔ یہ وہ چراغ تھے جو مزار پر وہ دو تین یمن یا زیادہ سے زیادہ چادر چادر کی تعداد میں جلتے تھے اور جو کہ یہ چراغ جہانے دالے وہ شرط پوری نہیں کرتے تھے۔ یعنی سات جماعتوں تک سات چراغ نہیں جلا سکے تھے۔ اس لئے ان کے چراغ مزار سے اٹھا کر باہر بھیج دیئے گئے تھے تاکہ نئے مزاروں لگنے والوں کو بھی قسمت آسانی کا موقع ملتا رہے۔ یہ چراغ باہر کون پھینک دیتا تھا۔ اس سوال کے مختلف جواب دیئے جاتے تھے کہ لگ کہتے تھے کہ بابا صاحب کے واحد مریضی جی میاں جو ایک مذہب چاہ اپنی جھمپٹری چھوڑ کر اس طرح غائب ہو گیا تھا کہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہی آدمی رات کو باقاعدہ یہاں آتا ہے اور چراغ باہر بھیج دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شمال سے آنے والی سوز چوٹی ہی ان چراغوں کو دھکیلتی ہوئی دروازے سے باہر لے جاتی ہیں اور یہ چراغ اس عمل کے دوران ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

جہاں ہی گاؤں کا سب سے متوال آدمی نامرغاں تھا جس کی زندگی اراغی میں مریعوں پر مشتمل تھی اور جس کی حویلی کے گاہن میں سو کے قریب چادر پائیاں بچائی جاسکتی تھیں۔ نامرغاں ان آباد کاروں میں سے تھا جو سب سے پہلے یہاں آئے تھے آدمی تجربہ کار اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے سال کے آٹھ میں مستقبل کے واضح خد خال دیکھ لئے تھے وہ کشتیاں جلا کر یہاں آیا تھا یعنی اس نے اپنی تھوڑی سی شہری جائیداد فروخت کر دی تھی اور ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ مقام پر رہائش پذیر ہو گیا تھا اس نے وقت سے غافلہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اراغی پر اپنی ملکیت جمالی تھی۔ پیسہ پاس تھا غریب لوگوں کو اپنا مزارع بنایا اور اس طرح اس کی دولت اور ذاتی دجاہت میں دن رات اضافہ ہونے لگا۔

گاؤں کے لوگوں کی تفریح و آبادی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بابا صاحب کے مزار پر جا کر چراغ جلائے کی شرط پوری کرنا بہت مشکل ہے اس لئے وہ لوگ ادھر کا رخ ہی نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہو جاتی تھی تو وہ اپنے کٹھن سفر پر مباد ہو جاتا

تھا لیکن جو تھے پانچویں چراغ کے بجھ جانے پر اس کی اپنی طبیعت اس طرح بجھ جاتی تھی کہ وہ پھر زندگی بھر ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا البتہ شہرے کوئی نہ کوئی آگاہی رہتا تھا اور جو بھی آگاہ تھا وہ سیدھا نامہ خان کی طرف جاتا تھا اور نامہ خان اس وقت اس کے رہنے پہنے کا بندوبست اپنی عمر بھر کی دیتا تھا اور پہلے دن کے بعد اس سے یکسر بے نیاز ہو جاتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ وہاں دو تین جھوٹے ہی یہاں بسر کرے گا اور جاتے ہوئے ملے گا بھی نہیں۔

بیسے میں ایک دو قسمت آنا ضرور آجاتے تھے۔ کوئی مرد تو شاید ہی آتا تھا۔ عام طور پر عورتیں اور وہ بھی عمر رسیدہ ہی رہتی تھیں مگر اس مرتبہ ایسا ہوا کہ تین بیسے گزر گئے اور نامہ خان کی عمر بھر کے بڑے بھانگ پر کسی نے بھی دستک نہ دی۔ نہ جانے گاڈن والوں کو اس سے اپنی اجتماعی زندگی میں ایک صدیکوں محسوس ہونے لگا تھا چہ پال میں جب بھی کچھ لوگ بیٹھتے تھے تو سیرانچیا یا زیتون مارنے سے پہلے اس کی کا تذکرہ ضرور کرتے تھے اور نامہ خان کے منشی منظور سے کو تو یقین ہو گیا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا چنانچہ اس نے عمر بھر کے جو کچھ دے کے کہہ دیا تھا۔

چاپادرات کو آرام سے سو جایا کر۔ بابا صاحب کے مزار پر کوئی نہیں آئے گا۔

اور جو کچھ یاد چاچا مرزد لے۔ بات پہلے بانڈھ لی تھی۔ وہ اس امر سے بے نیاز ہو گیا تھا کہ جہولت کو کوئی شخص مٹی کا چراغ اور ماس لے کر حویلی سے نکلے گا اور آدھ رات سے پہلے پہلے لوٹ آئے گا وہ پھانگ کے پہلو میں رکھے ہوئے رخ کے اوپر بیٹھے بیٹھے اور گھیسے گھٹا تھا اور پھر اور گھیسے اور گھیسے سو جاتا تھا۔

جو تھے بیسے کا پہلا ہفتہ شروع ہو گیا تھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی کہ جاگیردار نامہ خان اپنی سفید گھوڑی سے نیچے اتر اور اسے مرزد کے حوالے کر کے پھانگ کی طرف جا رہا تھا کہ ایک بوڑھا نے نہیں کا لباس پہنا کھینچا تھا اور جس نے ہاتھ میں ایک تھیلہ اٹھا رکھا تھا۔ پھانگ کے پاس ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

ناصر خان بارہم ایسے لوگوں سے بھاگ کے سامنے مل چکا تھا اس لئے یہ اندازہ لگانے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی کہ یہ عورت کس مقصد کے ساتھ آئی ہے اور اس سے کیا توقع رکھتی ہے۔
”ٹھیک ہے۔“ ناصر خان نے رٹا ڈھلایا جلد بوڑھیا کی طرف پھینک دیا۔

ناصر خان جب یہ جلد زبان سے نکالتا تھا تو اسے کھلم کھلے سینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی چونکہ دار پھان کو ساتھ لے کر اسے حویلی کے ایک کمرے میں پیسچا دیتا تھا اور اس وقت اس کے قیام تک کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دیتا تھا۔

ناصر خان پھاٹک کے اندر چلا گیا تھا۔ حویلی کے مطابق بوڑھیا کو چونکہ دار کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانا چاہیے تھا مگر وہ وہیں کھڑی رہی، ایسا پسے کبھی نہیں ہوا تھا تو اب کیوں ہو رہم تھا۔ ناصر خان چند قدم چل کر رک گیا۔
”ہر ذرا اس نے چونکہ دار کو پکارا۔“

چونکہ دار نے بوڑھیا کو چلنے کا اشارہ کیا اور وہ چلنے لگی۔

ناصر خان نے پھاٹک کے اوپر جھپٹتے ہوئے سو پارے کے بلب کی روشنی میں بوڑھیا کو دیکھا۔
”میں جبرے میں اسے ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا اسے یاد آ گیا کہ ایسی کیفیت اس نے اس جھونکے جبرے پر بھی دیکھی تھی جو سڑا رہا تھا تو اس چرخ جلا کر اپنی سڑا پانچلی تھی۔“
”تو کون ہے؟“ جاگیردار کے لیے میں کڑھکی تھی۔

”میں۔ میں۔“ بوڑھیا اس ہی لفظ کہہ سکی۔

وہ گھور گھور کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”اماں! تو کتنی کیلے ہے؟“

”پتھر میں تو میں۔“

ناصر خان کے قریب آ گیا۔

”تو بھی؟“

بڑھیا اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

”اماں تو بھی ساتواں چراغ جلائے گی۔“

بڑھیا کا چہرہ جو پہلے تذبذب کا نشانہ بنے ہوئے تھا اس پر ایک ایسا اندر جھلکانے لگا جو طلوع آفتاب کے وقت مشرقی افق پر تھوڑی دیر کے لئے برقرار رہتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔

نامہر خان چند لمحوں میں ٹھہر کر چلا گیا۔

بڑھیا کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی نظر سب سے پہلے مٹی کے ان چند چراغوں پر پڑی جو ایک طرف ایک چھوٹی سی میز کے اوپر پڑے تھے چراغوں کے پاس کچھ روٹی بھی نظر آ رہی تھی۔

میز کے علاوہ کمرے کے اندر ایک چارپائی بھی تھی۔ مین کا ایک لٹن، ایک دیگی اور اس قسم کی گھڑیلو استعمال کی کچھ اور چیزیں بھی موجود تھیں۔

جو کیدار بجلی کا بلب روشن کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بڑھیا دروازے کے قریب تک کر کمرے کا جائزہ لیتی رہی اس کے دل میں ایک ہیجان سا رہا ہو گیا۔ اس نے اپنا حقیقی میز کے اوپر رکھ دیا اور اس کی انگلیاں ان چراغوں کو چھوئے گیئیں جن میں تیل کی ایک ہونہ بھی نہیں پڑی تھی۔ اسے یکایک خیال آیا کہ جو بھی یہ چراغ لایا ہو گا وہ کتنی اس کے ساتھ آیا ہو گا اور پھر مایوس ہو کر چلا گیا ہو گا۔

اسے اپنا خیال آ گیا۔ وہ ایک ایسے کپڑے کی طرح تھی جس کو دھو کر پودے طرح اس کو پانی نہ بخوڑا گیا ہو اور اس حالت میں سبز گھاس پر کھیر دیا گیا ہو۔

دھوپ کی شدت کپڑے کے اس باقی پانی کو بھی جڑس لے گی۔

اس کا سر گھونٹنے لگا اور وہ چارپائی پر گرے ہی والی تھی کہ جاگیردار کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہاں تو بھی ساتواں چراغ جلے گی۔ اور اس کے باطن میں پھر ایک

اضطراب پیدا ہو گیا۔

جمرات آنے میں دو دن باقی تھے۔ دوسرے دن صبح سویرے اس نے پھیلے میں سے مادی ہیز میں میز پلاٹر لے دیں۔ ان میں کڑوے تیل کی ایک بڑی بوتلی تھی۔ دس بارہ نئی کے چراغ اور دو نئے کا ایک بندل۔

جس وقت وہ تھوڑی تھوڑی روٹی لے کر تیاں بنا رہی تھی تو ایک دم اسے احساس ہوا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر نہیں، مہرچی دو انڈے کے اندر اپنے جھوٹے سے جڑی مکان میں ہے اور وہ ہڈی چھپے پر رکھ کر پرانے موڈ سے پریشانی، دو انڈے کی طرف ٹکلی باز دھ کر دیکھ رہی ہے جہاں وہ جبرہ نظر نہیں آتا جو نو سال پہلے غائب ہو گیا تھا۔

شوہر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا چراغ دین ہی اس کا واحد سہارا تھا۔ بارہ سال تک وہ بڑا ذمے دار بیٹا بنا رہا۔ ماں کو کبھی اس سے کسی قسم کی شکایت نہ ہوتی تھلے کے میسوں گھروں تک جانا، وہاں سے پہلے کپڑے لانا، ہر پہننے ان سب کپڑوں کی لڑیاں بنا کر دریا پر لے جانا، دھوروں کے ساتھ مل کر انہیں دھونا اور پھیل جونی دیت پر سکھانے کے لئے پھیلا دینا غلام کے بعد انہیں اپنے بیل پر لاد کر گھر لے آنا اور رات کو گیارہ بارہ بجے تک ان پر استری پھیر کر الگ الگ گاہکوں کے کپڑے نہ کر کے رکھ دینا اور دوسرے روز صبح سے سنے کر قمرے پر ہر تک گھر گھر کپڑے پہنچا کر اجرت وصول کرنا۔ یہ سب کام وہ بڑی ہتھکنڈ کے ساتھ کرتا رہتا۔ ان سب کاموں میں اس کی ماں بھی برابر اس کی مدد کرتی رہتی تھی مگر وہ چاہتا نہیں تھا کہ اس کی بوڑھی ڈیوین کو تکلیف دے۔

تیرھویں سال شروع ہوا تو نہ جلنے کے طرح سے اسے بولنے کی است پر لگنی گئی دن اور رات کی راتیں حوالات میں بھی گزار دیں۔ لیکن یہ است دور نہ ہو سکی بلکہ بڑھتی چلی گئی۔ ایک رات وہ بڑی دیر سے گھوم آیا، صبح اسے ایک سہانے بتایا کہ اسے گرفتار کرنے کے لئے پولیس آ رہی ہے۔ اس نے ابھی کچھ کا ایک ہی نمونہ ہی میں تھوڑا کرتی سے اتار دیا کہ جلدی سے پاؤں میں

جوتے ڈال کر برقیوں سے اترنے لگا۔ ماں پیچھے آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔
اس کے بعد اس کی ماں اس کی صورت نہ دیکھ سکی۔

اس کی زندگی کے سب سے خوشگوار اور مسرت بخش وہ لمحے ہوتے تھے جب وہ دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے بیٹے کے بیل کی گھنٹیوں کی آواز سنا کرتی تھی۔ یہ بیل شام کے بعد واپس گلی میں داخل ہوتا تھا اور گلی میں داخل ہوتے ہی اس کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ گھنٹیوں کی آواز سن کر وہ عجزی سے دروازے پر کھڑی ہوتی اور جب تک ایک ایک کر کے ساری لڑیاں اندر رکھوا نہیں لیتی تھی اسے جین نہیں پڑتا تھا۔

وہ سارے کام مزے لے لے کر کرتی تھی اسٹری میں سے بچی بچی داکھ باہر نکالتی تھی۔ بچے چوڑے تختے پر جس کے اوپر ایک ایک کھڑا بچا کر اسٹری کی جاتی تھی۔ اس کی چادر بدل دیتی تھی۔ کونلوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈال کر یہ اندازہ کر لیتی تھی کہ ان سے کام چل سکتا ہے یا نہیں، نیم سوختہ کوئلے رکھ کر باقی داکھ لے کر باہر پھینک دیتی تھی۔

چراغ ابھی گھر سے دور ہی ہوتا تھا کہ وہ صدمتے جاداں۔ ساری جاداں کہہ کر اس سے جا کر لپٹ جاتی تھی۔

مگر پہلے نو سال سے اس کے گھر میں اور اس کے دل میں تاریکیاں ہی تاریکیاں چھا چکی تھیں۔ اپنے بیٹے کو پانے کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ سیانوں نے جو کچھ کہا تھا وہ کر چکی تھی۔ مگر اب وہ تنہا چکی تھی۔ بالکل مایوس ہو چکی تھی کہ اس نے بابا صاحب کی کرامت کا حال سنا اور وہ اسے آخری سہارا سمجھ کر جائیداد کے یہاں آ گئی۔

اس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں اور اس کی انگلیاں متواتر حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے سامنے جیتوں کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔

”اتنی ساری بتیاں۔ اپنا رونا کونسا؟“

یہ الفاظ جائیداد کا مرنے والے نے کہے تھے جو شاید جب سے چوٹی بنی تھی تیسری مرتبہ اس

کمرے میں داخل ہوا تھا۔

بوڑھیالے ایک نظر بیٹوں پر ڈالی اور پھر ناصر خان کو دیکھنے لگی جس کی مونچھوں کے بال جھک کر ٹھوڑی کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میں نے سنا ہے تمہارا پٹا نو سال سے غیب ہے۔“

بوڑھیالے اثبات میں سر ہلادیا۔

ناصر خان چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”تمہارا کام کیا ہے؟ اس نے بوڑھیالے سے پوچھا۔“

”ناظر؟“

”ناظر ناصر خان نے چند سیکنڈ بوڑھیالے کو گھور کر دیکھا اور پھر یوں سر ہلانے لگا جیسے اس کے دل میں کسی بات کی تصدیق ہو گئی ہے۔“

”کوئی تکلیف؟“

بوڑھیالے نفی میں سر ہلادیا۔

کمرے سے اب ناصر خان کا فنی اتار میں حساب کتاب کے لیے لیے جھڑنے اپنے ایک کے خارج ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ناصر خان کی اس پر نظر پڑی تو وہ دانے کی طرف جانے لگا۔ جمرات کی شام کو جھکڑ چلنا شروع ہو گیا تھا۔ بوڑھیالے چراغ میں جتی اور تیل ڈالا اور سرے اتار میں اجس پکڑی بسم اللہ کہہ کر تھامرا کی طرف روانہ ہو گئی۔

کسی کیستوں سے لوٹ رہے تھے اور ان کے پیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بوڑھیالے قدموں میں چمڑی آگئی۔ بسندان راستوں سے گزرتی ہوئی وہ مہرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے وقت بھی اس کے کانوں میں پیلوں کی گھنٹیوں کی آواز گونجنے لگی تھی اور وہ ان سرا کی ہواؤں سے بے نیاز تھی جس کے جھونکے مہرے کی دیواروں سے ٹکرا کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔ اس نے تلی کو باجس کے کنارے پر دگڑا۔ آہستہ سے اسے جتی کی لوکی طرف بڑھایا۔ ایک

ہنگی مٹی مٹنی پھوٹ پڑی۔ جلتا ہوا چراغ اس نے مزار کے ایک طرف رکھ دیا۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور چند لمحوں بعد انگلیوں سے دعا اداں پرہیتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کر کے جلتے ہوئے چراغ پر آخری نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

وہ قدم اٹھا رہی تھی مگر اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔ یہ ایک عمری کے جو کیدانے کو سخت لمبے میں پرچھا۔

”کیا ہوائی صاب؟“

بوڑھیا نے اپنی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی اور پچانگ میں سے نکل گئی۔

کمرے میں جا کر اس نے بائیس میٹر کے اوپر دکھ دی۔ چار دہائی پر جا رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کے اندر آتے وقت اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر اس کے ذہن میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس وقت دہائی جا کر اس کے دونوں ہاتھ کھول دیئے اور ٹنگل ہاتھ کر اور دیکھنے لگی۔

دوسری دھڑکی اور پھر چوتھی جمعرات بھی گزر گئی اور بارشمال کے سرد جھونکے اس کے جلائے ہوئے چراغوں کی لوؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔

پانچویں جمعرات کو جب اس نے چراغ جا کر مزار کے پہلو میں رکھا اور مدھم دھننی میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو اسے یکدم احساس ہوا کہ ایک سایہ اس کے قریب حرکت کر رہا ہے۔ اس احساس کے باوجود اس کے قدم آلود ہوٹ لڑتے رہے۔

دونوں ہاتھ پیر پیر کردہ مڑی۔ اور اس نے دیکھا کہ ایک جلتا ہوا چراغ مزار کے دوسرے پہلو کی طرف جھکا جا رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک دھندلا سا چہرہ دکھائی دینے لگا جس کے گرد وہ پڑ پڑا ہوا تھا۔

دو تین لمحوں کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے ہونٹ لڑتے رہے اور پھر دونوں کی نظریں ہنک گئیں۔

بھانندہ تیر تھی۔ اور کسی اثر نے ہرے پرندے کی جیخ فضا میں تحلیل ہو گئی۔ وہ جب حویلی کے پھاٹک پر پہنچی تو اس مرتبہ جو کھداد برزود نے کوئی سوال نہ کیا اور پھاٹک کا ایک پوٹ کھول دیا۔

”یہ کون ہے؟“ اس نے چار ہانی پرلیٹ کر خود سے سوال کیا۔

”کوئی ہوگی۔ میری طرح بد نصیب۔ دیکھا دئی۔“

چھٹی جمعرات کو وہ بابا صاحب کے مزار کے پاس پہنچی تو اسے مزار کے پہلو میں ایک جلتا ہوا چراغ نظر آیا۔ اس چراغ کے ساتھ باچا اور چراغ تھے جو بجھ چکے تھے مگر گنا تھا اس چھتے چراغ کی نو سے جو دم ہی روٹنی پھوٹ رہی ہے وہ ایک روشن ٹیکری طرح ان کے اوپر پھیل گئی ہے۔ اس نے اپنا چراغ جلا یا اور چراغوں کے پہلو میں رکھ دیا اور جب دونوں ہاتھ پھیلا کر سیکڑوں بار دہرائے ہوئے الفاظ اپنے ہونٹوں سے نکالنے لگی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھ نیچے کر کے اپنی جھولی کے کناروں کو پکڑا اور آنسوؤں نے اس کی جھولی میں گرنے لگے اس نے آنسو بھری آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ اس کا چراغ جل رہا تھا اور دوسری طرف دوسرا چراغ بھی جل رہا تھا۔ اس نے یکایک غموں کی کدوؤں پر اظہار کی تو اس کے آنسوؤں میں سے گزرتی ہوئی آنکھوں کے اندر سہلی جا رہی ہیں۔

وہ دیر تک جھولی پھیلتے کمزری رہی۔

اس رات وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھی رہی اور جب آٹھ بجے سو نوواں ہوئے لگے تو بھرے سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلے وقت اس نے ایک لمحے کے لئے پاٹ کر دیکھا۔ ذرا فاصلے پر دونوں چراغ روشن تھے آخر ساتویں جمعرات آگئی۔

مذہب کی غماز کی آواز بلند ہوئی تو اس نے چراغ بجایا اور ماہیں سنبھالی اور صبح اللہ کہا کہ چلے گی۔

اوپر ستارے چمک رہے تھے اور ہوا خامی قریز تھی۔ وہ خاموش اور ان راہ پر قدم اٹھانے مقبرے کی طرف جا رہی تھی۔

کسی قریب علاقے میں شہر بادشہ ہونی تھی جس کا پانی پینا ہوا تھیں حصول میں آکر جابجا ٹھہر گیا تھا کہیں کہیں پر پانی زیادہ گہرا تھا اور اسے بڑی شکل سے آگے بڑھنا پڑا تھا۔

جب وہ مزار کے قریب کھڑی تھی تو اس کے دل میں ایک ایسا جان بڑھا تھا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور سانس چھپنے میں لگ سا گیا تھا۔

اس نے باجس کی رنگی جلدی، چراغ کی نوکی طرف بڑھائی اور چراغ روشن ہو گیا۔

یہ چراغ آہستہ آہستہ مزار کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ ایک آہ اس کے کان تک جا پہنچی تھی۔

اس نے سانس دیکھا۔ مزار سے کچھ اوپر ایک بیٹھا ہوا یاد اور اس سے ذرا ناصطیہ پایک ایسا چہرہ جو اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے اس پر کئے کا عالم طاری ہو۔ ایک گرم گرم لہر اس کے مارے جسم میں سرایت کر گئی۔

اس کا ہاتھ مزار کی طرف حرکت کرنے کی بجائے اوپر جانے لگا۔ وہ سوسے لمحے میں بیٹھا ہوا چراغ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا اور اس کا جلتا ہوا چراغ اس دائرہ عورت کے ہاتھ میں جو ایک کھنڈر کی دیوار کی طرح ٹھکی ہوئی تھی۔

تین چار لمحوں میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

بیٹھا ہوا چراغ نے کردہ ایک یکتا بھی دہاں نہ ٹھہری۔ مقبرے سے باہر آگئی اور مزار کی طرف چلنے لگی۔

ہوا کے متعدد جز تھپڑے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ بار بار اس کے قدم ڈکھڑا جانے تھے

مگروہ برابر چلی جا رہی تھی تاکہ ہی آگے کسی منزل کا تصور نہ بیٹھ جیسے خود نے کسی نے اسے نشانہ کر دیا ہو اور وہ کہیں بھی نہ لگتا نہ چاہتی ہو۔

پھر بادشہ ہونے لگی اور بادشہ کے بھاری بھاری قطرے چراغ کے کناروں پر اور چراغ کے اندر گرنے لگے جب یہ قطرے چراغ کے کناروں سے ٹگتے تھے تو شی کی ہلکی سی آواز آتے لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پچھیاں پھیل گئیں۔ اس کے تھکے ہوئے ضعیف پاؤں میں ایک ماسلم سی قوت آگئی۔

بادشہ کے قطرے گر رہے تھے، آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ شی شی، شی شی، شی شی۔ وہ کہیں بھی نہ لگی۔ تیز رفتور ہوا میں برابر چل رہی تھیں۔ بادشہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ بادشہ ختم لگی مگر ہواؤں کی تندی و تیزی میں کوئی فرق نہ آیا۔ صبح ہو گئی تھی۔ کسان اپنے اپنے بیلوں کو نئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک ان کے قدم رک گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا یا بلی جا رہی ہے اور طرفانی ہواؤں میں اس کے ماتھے میں تھا ہوا چراغ چل رہا ہے۔ بوڑھا کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ اس نے چراغ کی طرف ایک لمحے کے لئے بھی نہیں دیکھا تھا وہ چلی جا رہی تھی اور اس کے دائیں بائیں اور پیچھے جہاں دوسرا سید لوگ قدم اٹھا رہے تھے۔



یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کے وسطی حصے میں ایک نو تعمیر شدہ منبرے کی دیواریں کھڑی ہیں۔

قبیلے کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہاں ایک بزرگ خاتون دفن ہے جس کا چراغ طوفانی ہواؤں میں بھی جلتا رہتا تھا۔ اس لئے اسے چراغ بی بی کہتے ہیں۔

ہر روز عقیدت مند یہاں آتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں خاص طور پر وہ لوگ جن کے بچے گم ہو گئے ہوں۔

مزار کے سر ملے ایک مٹی کا چراغ ساری رات جلتا رہتا ہے۔

گریٹ مین

اندھی رات سے کچھ زیادہ وقت گزرا ہو گا کہ فوراً اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس تاریکی میں کسی ایسی کرن کی تلاش میں تھی جو اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر جائے۔

یہ پہلی رات نہیں تھی جب وہ اس درجہ بے تاب ہو گئی تھی کہ اندھی رات سے زیادہ لٹا بھی نہیں سکی تھی۔ ایسی کئی راتیں آئی تھیں اور ان راتوں میں یا تو وہ سارا وقت کمر نہیں دیتی رہی تھی یا اٹھ کر باک طرف بیٹھ گئی تھی اور پھر ایک لمحے کے لئے بھی سو نہیں سکی تھی۔

وہ ایک غریب بیوہ تھی، دنیا میں اس کا کوئی بھی سہارا نہیں تھا، گھر کا خرچ چلانے کی خاطر دھٹے کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور تھی۔ اس کا اسے دکھ ضرور تھا مگر یہ کوئی ایسا دکھ نہیں تھا کہ وہ چوری چوری رات آنکھوں میں گناہ دے اس کے دکھ کی اصل وجہ اس کا بیٹا تھا، پچیس سال کا نواب جو اندر کمرے میں سو رہا تھا۔

نواب سے اسے بد شکایت نہیں تھی کہ وہ کچھ بڑھو لکھے نہیں سکا تھا، کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا، گھر کی ذمہ داریوں میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا، ایسی باتوں کا لگھو تو اسے اس وقت ہوتا جب نواب ایک نارمل انسان ہوتا اور وہ نارمل انسان تھا ہی نہیں۔

ماں نے جب اس کا نام نواب رکھا تھا تو وہ غیر ضروری طور پر چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کہ دولت مند بنے، آپ کھائے ماں کو کھلائے اور وہ نواب تو بنانا تو خیالی دنیا کا، اس کے دل میں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑا آدمی ہے اور سب کے سب اس کی عزت

کرتے ہیں احترام کرتے ہیں اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں وہ خود کو گریٹ میں قصور کرتا تھا اور یہ اس بناء پر کہ چراغ دین ٹھیکیدار کا بڑا لڑکا جو کسی کالج میں پڑھتا تھا اس نے نواب کو بتایا تھا کہ تم گریٹ میں ہو یہ لفظ سن کر نواب ہونٹوں کی طرح اسے دیکھنے لگا تھا۔
 ”اے یہاں تم گریٹ میں ہو گریٹ میں کا مطلب ہے بڑا آدمی، تم بڑے آدمی ہو یعنی گریٹ میں ہو۔“

نواب نے یہ لفظ یاد کر لئے تھے اور انہیں بلا عمل اور بلا خودت اپنے ہونٹوں پر لے آتا تھا محلے میں اکثر لوگ مذاقاً اسے گریٹ میں کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ نواب اس طرح پکارتے جانے پر وہ بھولا نہیں سمجھتا تھا پہلے پہل اس نے سوچا تھا ابھی جھوٹا ہے۔ یہ نہیں سوچ سکا کہ لوگ گریٹ میں کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں جب بڑا ہو جائے گا تو اصل حقیقت سمجھ لے گا مگر اس کی یہ امید ناک میں مل گئی کیونکہ نواب وہ سڑوں کے ذال کو مذاق سمجھ ہی نہ سکا وہ خیال کرتا تھا کہ محلے کے چھوٹے بڑے جو مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر اس کو سلام کرتے ہیں اور گریٹ میں کہہ کر نواب کو کہتے ہیں تو یہ سب کے سب ذاتی اس کا احترام کرتے ہیں اور حقیقتاً اسے گریٹ میں ہی تصور کرنے میں اور یوں وہ زیادہ سے زیادہ انا پرمل ہوتا چلا گیا۔

نواباں صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا جھک ایک پھوٹی کوڑھی کا کہ گھر میں نہ لائے دن بھر بے کار بیٹھا رہے مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کام کرنے کے لئے اس گھر میں بھی جائے گھر کے لوگ ہنس ہنس کر اس سے پوچھیں۔

”نواباں! کیا حال ہے تیرے نواب کا تیرا گریٹ میں کیا کر رہا؟“

وہ اس طرح کو خوب سمجھتی تھی اور یہی احساس اس کے لئے اس قدر اذیت ناک ہو گیا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کاش اس کا بدبخت بیٹا مر جائے تاکہ بروڈ اس سے نہ ہر کے گھونٹ نہ نہ پینے پڑیں۔

محلے کے بڑے آئے دن اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واردات کر دیتے تھے اسے کسی غفلت میں صدر

بنایا جاتا تھا اور جب وہ بیٹھے لگتا تھا تو کسی کھسکا کر اسے گرا دیا جاتا تھا اور پھر مٹانی مانگ لی جاتی تھی۔ اسے ایسی مٹھائی کھلانی جاتی تھی جس میں نمک بھرا ہوتا تھا اس کی نشان میں بے قیدے پڑھے جاتے تھے جن میں اس کا بی بھر مٹائی اڑا دیا جاتا تھا۔ لیکن وہ تھا کہ اس سارے مذاق کو اپنی نشان میں اظہار عقیدت ہی سمجھتا تھا۔

اگلے دن اس کے گلے میں ایک بڑا سا مار ڈالا گیا تھا۔ جس میں بچوں کے ساتھ کپڑے میں پٹی ہوئی کوئی شے بھی تھی۔ نواب یہ امر پس کر بڑی آن بان نشان سے گھر کی طرف جا رہا تھا اور محلے کے بچے اس کے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے جب وہ گھر کی دھڑلے پر پہنچا تو اس نے اس کا ہار تو بچ لیا اور کپڑے میں لپٹا پرانا جوتا نکال کر اسے تالیاں بجانے والے بچوں پر دے مارا اور کم از کم آدھ گھنٹہ تک انہیں بد عادتوں میں مبتلا کر دی۔

اس کا بیٹا کا اہم حق ہو گیا ہے کہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ لوگ اسے ذلیل کر رہے ہیں یہ بات اس کے لئے سوائے مدح بن گئی تھی اور وہ اپنی ذات کے احساس سے اندر ہی اندر سنگ رہی تھی مگر اس کو بے چارہ بنانا تھا کہ اس سے لڑا جاتا۔

• ہاں تو بالکل ہو گئی ہے یہ میری عزت کسے میں۔

عزت کسے میں عزت کرنے کے لئے گلے میں جو تے ڈالے جاتے ہیں؟ اور اس نے بیٹے پر اس زور سے دو جھڑا مارا کہ وہ ہلکا اٹھا۔

خود اس کے گھر میں سب لگی ایسا جھگڑا۔ اور یہ تھا تو لڑکا اس بڑائی بھائی ہوئی آجانی تھی اور وہ وہی غرور کھتی تھی جو وہ کئی بار کھینچی تھی۔

• خوراں وہ تو بھلا ہے تو بھی بالکل ہو گئی ہے۔

اور خوراں اس کے جواب میں اپنے کرتے کا دامن پھیل کر ایسا دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہتی۔

• لڑکا اسے کسی کی آئی آجانے پا جھے اٹھائے!

اس دن بھی اس نے سہری دھاک مٹی اور غراب یہ کہہ کر دروازے میں سے نکل گیا تھا۔
اب میں اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا:

مگر حسب معمول وہ شام کو گھر آ گیا تھا اور اس وقت اندھ کرے میں سو رہا تھا۔

خود اس کے ذہن میں تلخی بھر گئی۔ اس نے چارپائی سے نیچے اتر کر گھڑے میں سے ٹنڈے پانی سے مٹی کا وہ پیالہ بھرا جس سے گھڑے کو ڈھانپا گیا تھا۔ سرور پانی جب اس کے قلعے سے نیچے اترتا اسے ذرا سا سکون مل گیا۔ مگر یہ سکون عارضی تھا کیوں کہ اسے پھر ایک بات یاد آ گئی تھی جس نے اسے تپا کر رکھ دیا تھا۔

میاں نور محمد کے ہاں جو صورت برتن بالیجا کرتی تھی وہ برباد ہو کر اپنے گھاؤں جلی گئی تھی اور میاں صاحب کی زبوی نے نور اس کو کہلوا بھیجا تھا کہ وہ اس کے ہاں کام کیا کرے۔ نور اس کو تو کام کرنا تھا۔ کیس کی جودہ میاں صاحب کے ہاں چلی گئی۔

جس لمحے وہ داداں میں سے گزر کر کرے میں پہنچی میاں صاحب اپنی ہیکھڑی داڑھی میں کلنگھی پھیر رہے تھے۔

داداں نے سلام کیا۔

”وہیکم اسلام۔ نور اس بہن! کیا حال چال ہے۔ میاں صاحب نے کلنگھی میز پر رکھ کر سرور دانی اٹھائی اور آنکھوں میں سرور ڈالتے ہوئے یہ سوال کیا۔

”اندھ کا شکریہ میاں جی!“

”اس شکر کی آواز کرنا چاہیے۔۔۔ پر ہندہ بڑا نا شکر ہے۔“

جی میاں جی!

”کیا کام ہے نور اس بی بی!“

”وہ جی آپ کی بیگم نے بلا ہے۔ ناظر بیار ہو کر چلی گئی ہے ناں۔“

میاں صاحب نے نور اس کو ذرا غور سے دیکھا۔

”تو تم غلط کی جگہ کلام کر دگی؟“

نورال نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”پر نورال! خیر! بیٹا تو گریٹ میں ہے، گریٹ میں کدیاں وہ سڑک کے برقی نہیں
بچھا کر تیں؟“

نورال کے ذہن میں جیسے شعلہ سا بھونک اٹھا، اور اس شعلے کی حرارت اس کے سارے
بدن میں سرایت کر گئی۔

میاں صاحب مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے یہ سکرامنٹ اسے زیرِ لگی اور وہ ایک لمحہ بھی
وہاں نہ ٹھہر سکی، اس وقت وہ خاموش رہی تھی، نگراب جو اسے یہ بات یاد آئی تو وہ میاں
صاحب کو بدعاشی دینے لگی۔
میاں بڑا جانا نہ اٹھے، تجھے سانب ڈس جائے۔

وہ بدعاشی دے رہی تھی اور اس کے اپنے الفاظ اس کے کانوں میں اس طرح اتر
رہے تھے جیسے ان میں گرم گرم تیل ڈالا جا رہا ہے، ایک مرتبہ اس نے گھبرا ہوا پکارا تو
سے لگا لیا اور زمین چار بجے، بے گھونٹ بھرے، آگہا یاں! ٹھوڑی سے گڑو کو گروں کو چھوٹا ہوا
گر بیان تک جا پہنچا اور وہ ہالہ ڈانٹتے میں ملنے لڑتی ملنے دیرار کو گھوٹتی رہی۔

آسمان میں ستارے پھٹکی پھٹکی روشنی دے رہے تھے اور ہر طرف سنا، چلایا ہوا تھا ایسے میں
جب میاں نور محمد کے کوٹھے سے سرنگے کی ٹکڑوں کوں کھتی ہوئی آواز بلند ہوتی تو اسے اس
جوا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

مرغا باگ پر باگ دے دیا تھا اور نورال کا جی چاہتا تھا، وہ اس کے قریب ہوتی تو
اس کی گردن ہی موڑ ڈالتی، اس نے میاں صاحب کی بیوی کو الٹی ہی دل میں نکالیاں دیکھیں
نے اسے پال پوس کرنا تھا مگر بنا دیا تھا کہ اس کی آواز کھلے میں دو، دو، تک گنج اٹھتی تھی۔
نورال کو معلوم تھا کہ جب مرغا باگ دیتا تھا تو اس سے تھوڑی دیر بعد مسجد سے آواز کی

آواز بھی آنے لگتی ہے مگر اس صبح صرف مرغیا ہی ساری فضا پر چھایا ہوا تھا۔ اذان کی آواز نہیں آئی تھی۔ شاید مؤذن سو گیا تھا یا مرنے نے وقت سے پہلے ہی لوگوں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔

نور ان گھڑے کے پاس کھڑی رہی۔ پیالہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پیالہ اوندھا کر کے گھڑے کے منہ پر رکھ دیا اور پھر برآمدے کا دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کمرہ نواب کا ڈرائنگ روم بھی تھا۔ کامن روم بھی اور خوابگاہ بھی دیواروں پر پرانے کیلینڈر، انگریزی اور دیسی اکبر رسوں کی تصویریں اور وہ دار کٹے ہوئے تھے جو نواب کے بزرگ خورشید عقیقت مندوں نے خاص خاص موقعوں پر اس کے گلے میں ڈالے تھے ان کے پتھروں میں تھا کہ ذراں کی صورت میں اپنے گھرے ہوئے تھے۔

نور ان نے اندر قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر چار پائی کے نیچے خوجی بوٹ پر پڑی۔ یہ بھاری بھر کم بوٹ، نسیم احمد فرحتی نرائے کے بیٹے نے نواب کو دیئے تھے اور یہ کہہ کر دیئے تھے کہ ٹریٹ مین۔ ایت بوٹ ہی پہنا کرتے ہیں۔

نواب کو پہلا ایسے بوٹ پہننے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے بڑی شان سے بوٹ لئے غدیہ گری کی وجہ سے اس کو ٹھوس ہوا جیسے اس کے پیروں کو گرم گرم ٹکٹے میں کس دیا گیا ہے۔ لیکن گر بوٹ مین کو تو سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس کے پاس یہ نو فٹاک بوٹ رکھ کر نور ان کے اندر میزبانی کی ہمدردی گئی۔

تو بھر سے اللہ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس وقت اس کی نظر بیٹے کے جیسے پر پڑی اس کا بھرپور پیلا پیلا دکھائی دے رہا تھا اور اس پر جا بجا بیٹے کے نظرے جنگ رہے تھے۔

نور ان کو غصوں میں ہوا کہ اس کے بوٹ حرکت کر رہے ہیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ نور ان کو شافی نہیں دے رہا تھا غصہ جانی تھی کہ وہ سوتے ہیں یہی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کرتا ایک

دوبارہ جب وہ دکان میں سویا ہوا تھا اس نے بیٹے کو بڑبڑاتے ہوئے پایا تھا اور جب اپنے کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے گئی تھی۔ تو اس نے سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اماں! میں گریٹ میں ہوں۔ اماں! تم نہیں سمجھتی میں کیا ہوں۔ گریٹ میں۔ گریٹ میں۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر سے ٹنگی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

نواب کا ماتھا ٹوچا ہوا تھا اور پھر اس کے چہرے پر اڑ رہے تھے۔
 نوراں بے قرار ہو گئی اور اس کے ہاتھ بے استیاری کے عالم میں بیٹے کی طرف بڑھنے لگے اس نے دور دور سے اس کے کڑھوں کو دیکھا۔ نواب نے پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیں۔
 کیا ہے اماں؟

میرا دماغ پھپھوکیا ہوا ہے۔

نواب نے زہرناک نظروں سے ماں کو دیکھا۔

اماں! تجھے ہزار بار کہا ہے۔ دوسرا ادب سے بات کیا کرو۔

کیوں دے ادب سے بات کیوں کروں۔ تو میرا جنا ہے یا تو نے مجھے جنا ہے؟

اماں نواب نے ہاتھ سے چھوڑ کر ہٹاتے ہوئے کہا تو جانتی نہیں۔ میں گریٹ میں ہوں۔
 نوراں نے زور سے زمین پر ہتھوڑا۔

کچھ صفت بڑی گریٹ میں پر۔ سب تجھے کھول کر رہے ہیں۔ تو نے تو میرے گھر کی ناک اٹا دی ہے۔

نواب اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی انگلیاں اس کے پر پھیر رہا تھا۔

اماں تو نہیں مانتی۔ میں گریٹ میں ہوں۔ گریٹ میں۔ بڑا آدمی لوگ میری عزت کرتے ہیں مجھے دیکھتے ہیں تو نوراں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سنا تو نے۔ سوگ چھٹاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسی وقت اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ میں گریٹ میں ہوں۔ اسی عزت گریٹ میں ہی کی کی جاتی ہے۔ نواب کا چہرہ جڑی جان سے سرخ ہو گیا تھا اس کے نچلے منہ پر تھکے اور وہ اس

بیٹے بھٹ کے اختتام پر وہ اسی قسم کے غڑے کبھی مٹی اور بار بار ہاتھ پر ہاتھ مار کر نصرت کو کو سنی تھی۔

وہ دروازے کی طرف مڑی مگر نور پاٹ آئی۔

”میں کبھی ہوں تو آج گھر سے نہیں نکلے گا اس نے حکم دے دیا۔“

نواب سر ہلانے لگا تو پاکرہا ہے: جہول میں آئے کہہ دے ہو گا وہی جو میں پسند کرتا ہوں۔
”میں کبھی ہوں تو گھر سے نہیں نکلے گا وہ نہ۔“

”میرا جنازہ نکلے گا: نکلے دو! اس! جنازہ ہی نکلے دو!“

وہ برداشت نہ کر سکی نواب پر ہل پڑی اس سے دھکاک دے کر چارپائی پر گر آیا اور اس کے ہاتھ اس کے چہرے، سینے اور پیٹ پر برستے رہے۔ خشک ہاڈر دروازے سے باہر نکلی۔ کدھی نکلائی اور لمبی لاسنے کے لئے پیاس فورم کے گھر جانے لگی۔

اس ناز و نہر ہر تک گھروں میں کام کرتی رہی اور یہ بھول ہی گئی کہ وہ نواب کو کمرے میں بند کر آئی ہے۔ وہ بچے کے گنگ بنگ وہ لوٹی ریخ اندوڑا کے گھر سے وہ نکلنا نہیں لیتی مٹی اپنا اور بیٹے کا کھانا لیتی تھی اور اس ناز و نہر چار دیوڑیاں اور ایک برتن میں ساگ لئے ٹھہریں تھیں۔ عقیلاں اور سالی کا تھی اس نے بڑے جیسے کے پاس دیکھ دیا۔ بند دروازہ دیکھ کر لمبے دے میرے رہا۔ اس کے منہ سے نکلا اور جلدی سے اس نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ نواب چارپائی پر آٹھیں بند کئے بڑا ہے۔

”نواب دے نواب اس نے بیٹے کو پکارا۔“

نواب نے کوئی حرکت نہ کی۔

”کیا عزت سے سو رہا ہے؟“

نواب پر اس غڑے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

خوداں سے غڑے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ایک لحظہ اسے غصہ میں ہوا مگر اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پس چر لے پر رکھا ہوا تھا بکڑ لیا ہے۔

وہ ڈر گئی۔

قواب پڑ قواب

قواب نے آنکھیں کھولی ہیں۔

میلوں والے آگئے ہیں، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی لمحے دکھوا کر گر پڑا۔

تین دن گزر گئے اور اس کا جنازہ اتنا چڑھتے روز دھیر موش ہو گیا اور اس کے ٹھیک ساتویں روز بعد وہ چارپائی کے اوپر ایک بے حس و حرکت، نحیف و زائد جسم کی صورت میں پڑا تھا۔

قواب مر گیا۔ قواب مر گیا۔

شخص "ا" سے کہتا تھا، دراصل وہ "د" سے کہتا تھا، مگر سارا مٹا کر محض کی تفریح کا ایک بہت بڑا اذیت ختم ہو گیا ہے۔

زبان ماموش تھی "ا" اس کے سامنے اس کے بیٹے کو نہلایا گیا، کھنڈا گیا، اس نے نہ تو زبان سے ایک لفظ کہا "رہنا آگھو سے ایک آنسو تک نہ پایا،
بھلے کی مورچیں منہ جوڑ کر کہتی تھیں۔

ہائے کسی ظالم ماں ہے نہ روئی ہے نہ مین کرتی ہے :-

اور خرابی با کھل نہ روئی، بھلے کی عورتیں اپنے سرے ہونے پر عزت یاد کر کے "روئی توئی"۔

چار مردوں نے جنازہ گڈھوں پر اٹھایا اور قبرستان کی طرف پہلے گئے جنازے کے ہمراہ صرف سات آدمی تھے، اور ان میں چار جنازہ اٹھانے والے بھی تھے آٹھویں ایک تھی جو اس طرح ہل رہی تھی جیسے خواب میں قدم اٹھا رہی ہے۔

جنازے کے ساتھ جانے سے اسے کسی نے بھی نہیں روکا تھا، دراصل اس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی تھی۔

جنازہ گلی سے باہر نکل آیا۔

ابجد علی میکہ لڑکی عربی میں کوئی تعریب تھی، عربی کے باہر اس بارہ آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے

انہوں نے جو جنازے کو آتے دیکھا تو سب کے سب استراٹھا کھڑے ہو گئے۔ فوراں نے انہیں کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا اور یک لحظہ اس کے قدم ہلک گئے۔

اس نے فعدے سے اپنی سیٹ پر دو ہتھ مارا اور ہلکے دھڑکے پر گر گیا۔ اس نے فعدے سے اپنی سیٹ پر دو ہتھ مارا اور ہلکے دھڑکے پر گر گیا۔ اس نے فعدے سے اپنی سیٹ پر دو ہتھ مارا اور ہلکے دھڑکے پر گر گیا۔

سائرہ

وہ ہسپتال پہاڑی علاقے میں تو نہیں تھا مگر پہاڑی علاقے کے بہت قریب واقع ہونے کی وجہ سے وہاں نضا عموماً سرودی رہتی تھی۔ اس لئے ہسپتال کا علاؤ غار سرا کے ساتھ ہی ہسپتال کے تمام کمروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دینا تھا۔ تاکہ ہوا کے خشک جھونکے کمرے کے اندر کمزریوں کو پریشان نہ کریں۔ اور جب ساری کھڑکیاں اور دروازے بند ہو جاتے تھے تو کمرے میں سرودی کا کچھ زیادہ احساس نہیں رہتا تھا۔ لیکن علی نواز جو ہسپتال کے پرائیویٹ روم فیرمات میں گذشتہ سو اسی ماہ سے مقیم تھا ملے کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی اس کھڑکی کے دونوں ہسٹ کھلا رکھتا تھا تاکہ اس کے سامنے سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر کھینچی تھی۔ شروع شروع میں نرس نے ڈاکٹر کی واضح ہدایت پر عمل کرتے ہوئے یہ کھڑکی بند کر دی تھی اور علی نواز نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ مگر جب وہ یہ زیادہ ڈاکٹر کے ساتھ راز ڈنڈ پر آئی تھی تو اس نے کھڑکی کو کھلا دیا تھا۔ ڈاکٹر نے کھڑکی کھلی دیکھی تو نرس کو ڈانٹ پھٹا۔ نرس نے اسی وقت کھڑکی بند کر دی جو چند گھنٹوں کے بعد ہی پھر کھل گئی۔ مریمین سے سوال جواب کرنے پر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کھڑکی کو بد وقت کھلی رکھنا چاہتا ہے۔ اور اس معاملے میں وہ ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرنے سے معذور تھی۔ نرس نے ڈاکٹر کو مریمین کے اس بیٹھے سے آگاہ کر دیا اور ڈاکٹر نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

نرس نے سمجھا تھا کہ علی نواز شاعر مزاج آدمی ہے کھڑکی کے باہر دیکھ کر اور گرد پیٹنے سے مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ علی نواز جب بھی

کھڑکی سے باہر دیکھنا تھا۔ اس کی نگاہیں اوپر نہیں نیچے فرض پر مبنی رہتی تھیں جیسے ہر آدمی میں یا لان میں آنے جانے والے لوگوں کا جائزہ لے رہا ہو اس نے صبح کے وقت بھی اُسے دیکھا تھا اور شام کے لمحوں میں بھی نہ تو طلوع آفتاب سے پہلے جہاں تہاں کبھرے ان نگاہیں اجاہوں سے اسے کوئی دلچسپی تھی اور نہ غروب آفتاب کے بعد بندیلوں سے اترتے ہوئے شفق آلود صحنوں کو وہ پُر مشوق نظروں سے دیکھتا تھا تو پھر یہ دیکھنا کیا ہے ! نرس لے اپنے آپ سے سوال کیا تھا ؟

اپنی دلوں سربل کافنی بڑھ گئی تھی۔ اور سارے مریض کیلوں میں اپنے آپ کو ہر وقت بیٹھ رکھتے تھے۔ اس نے علی نواز سے پوچھ ہی لیا تھا۔

”صاف کیجئے — آپ کھڑکی سے باہر کیا دیکھتے رہتے ہیں۔“

علی نواز نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تھا —

”کچھ نہیں — کچھ بھی تو نہیں۔“

نرس اس شق سے جواب پر کیونکر مطمئن ہو سکتی تھی ! بولیں۔

”آپ نہیں جانا چاہتے نرس آپ کو مجبور نہیں کر سکتی۔ ویسے سو ہوا آپ کے لئے ٹھیک نہیں بہت کمزور ہو چکے ہیں۔“

اور نرس نے یہ غصوں کر کے کو اس کے اہتمام کو دھکا لگا ہے فرض پر اپنی اپنی اڑی کی گرجانی سے ٹھٹھک کا شور مارتی ہوئی جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

اس واقعے کو پورا ایک دن بھی نہیں گزرا تھا کہ نرس صبح کے وقت اس کا ٹیبلر پر نوٹ کرنے کے لئے کمرے میں آئی تو علی نواز نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”نرس ! شاید دوسرے رنگ میں ایک ٹکڑی صبح و شام آتی جاتی رہی ہے۔“

”کون ٹوکی ؟“ نرس نے اسے حیرت ناک انداز میں دیکھنے ہوئے استدلال کیا۔

”ٹوکی — وہ جو شوخ رنگ کی ساڑھیاں پہنتی ہے ٹوکی اٹھائے لان میں سے

گنبدی ہے:

نرس نے علی نواز کو گھوڑ کر دیکھا، اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔

”آپ بوڑھے ہو چکے ہیں یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی اس لئے وہ کسی غدر، جھنجھلا کر بولی۔
ہزاروں لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ مجھے کیا پتا آپ کس لڑکی کو پوچھ رہے ہیں؟“

علی نواز کو افسوس ہوا کہ اس نے نرس سے یہ سوال کیوں پوچھا ہے۔ نرس اس کے جذبات کیمر کر جان سکتی ہے اور اسے کسی مرض سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

شام تک اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ رنگین ساڑھی میں لمبوس لڑکی جب لان میں سے گزرے گی تو وہ خود اس سے گفتگو کرے گا۔ آئندہ نرس سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہے گا چنانچہ شام سے ذرا پہلے جب سورتج پہاڑ کی بلند ترین چوٹی کے چھپے آہستہ آہستہ اندھیروں میں ڈوب رہا تھا وہ لان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ لڑکی آئی۔ اس روز اس نے گلانی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ ایک لمبہ تھ میں تروتازہ ہچھولوں کا گلہ است تھا اور دوسرے میں نوکری۔ علی نواز نے اسے دیکھا اور بلا ارادہ اس کا دایاں لمبہ اوپر اٹھ گیا۔ اور اس کے ہونٹ: ”جی کہتے مجھے غر خرا اٹھے۔
لڑکی کے قدم رک گئے اور وہ اسے حیرت ناک نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ کا کون پیار ہے جی؟“ اس نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے نظریں جھکائیں۔

”میرا شوہر“

”اللہ اسے صحت دے میں دعاؤں کا۔“

لڑکی ایک لمحہ بھی نہ رک اور دوسرے دنگ کی طرف جانے لگی۔ علی نواز اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

نام ابھی ہوئی نہیں تھی مگر شام کے سائے فضا میں بارہوں کے دواں دواں تانٹلوں کی

وجہ سے ہسپتال کے کان میں پھیل گئے تھے۔ علی نواز نے جانے کاکپ خالی کر کے تپانی کے اور پر دکھا تھا۔ اور بے خیالی کے عالم میں دیوار سے لگی ایک میز کے اوپر کبھوی ہوئی کتاب میں دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ کسی ایسی کتاب کا انتخاب کرنا چاہتا تھا جسے پڑھتے پڑھتے سو جانے اور ساری رات سوتا رہے۔ رات کو گیارہ بجے تک کتاب کا مطالعہ کرتا اس کا دوزمرو کا حصول تھا۔ جس میں خاندان اور یہی فرق پڑتا تھا۔

اس نے اچھو بڑھا کر ایک کتاب اٹھائی۔ یہ میر تقی میر کا منتخب کلام تھا۔ تیسرا مطالعہ وہ بڑے شوق اور دلچسپی سے کرتا تھا۔ تیسرے کے اداس کر دینے والے شعر سے ایک عجیب و غریب ناقابل بیان کیفیت سے دوچار کر دیتے تھے اور وہ کتاب بند کر کے درنگ اسی کیفیت میں گم رہتا تھا۔

ابھی اس نے تین چار شعری پڑھے ہوں گے کہ اس کے کان میں ایک باریک سی آواز آئی۔
”میں اندر آ سکتی ہوں؟“

علی نواز نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا وہی لڑکی پھولوں کا ایک گلہ ستہ دائیں ہاتھ میں لئے دروازے سے کچھ دور کھڑی تھی۔
”آ جاؤ یہی۔“

لڑکی اندر آ گئی۔

”صبح آپ نے بڑے غلوں سے مجھے بلایا تھا۔ اس لئے۔“

علی نواز نے ہدیرانہ شفقت سے مسور لہجے میں کہا۔

”جی! میں نہیں جانتا تمہارا نام کیا ہے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔ یہ گلہ ستہ بڑے خوبصورت پھولوں کا ہے۔“

”آپ کے لئے ہے۔ میں ان کے لئے ہر روز تازہ پھولوں کا گلہ ستہ لے کر آتی ہوں صبح جو۔“

وہ تھی وہ انہیں نے آپ کے کمرے کے لئے دے دیا ہے؟

صاف ظاہر تھا کہ ان سے مراد لڑکی کا شوہر تھا۔
 "بیٹھو گی نہیں بیٹی؟"

لڑکی نے گلدستے پیٹنے کے گلاس میں ٹکا دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بیٹی! تمہیں اس بات پر حیرت ہوگی کہ میں نے ہر روز تمہیں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔
 لڑکی بڑے خود سے علی نواز کو دیکھنے لگی۔

"تم بالکل میری اپنی بہو معلوم ہوتی ہو وہ جب چلتی تھی تو بالکل تم جیسی معلوم ہوتی تھی۔
 اس کا تعلق کراچی کے ایک خاندان سے تھا میرے اعلیٰ تہہ بیٹے نے جب اس سے شادی
 کی تو اس نے پہلے دن ہی مجھے احساس دلا دیا کہ وہ میری بہو بھی ہے اور بیٹی بھی پھر دو
 سال بعد وہ جرمنی میں چلے گئے۔ جہاں میرے بیٹے کو بڑی مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ سات
 سال ہو گئے ہیں۔ اس دوران میں دونوں میاں بیوی صرف ایک مہاجرہ میاں آئے تھے۔
 علی نواز کے چہرے کے نقش ٹہرے ہوئے تھے اس کی نظر میں فضا میں پھٹے لگیں۔ لڑکی
 نگاہیں جھپکاتے چپ چاپ اس کے الفاظ سنتی رہی جب وہ ایک لمبی آدھ بھر کر خاموش ہو
 گیا۔ تو لڑکی کرسی سے اٹھ بیٹھی۔

"وہ کب آئیں گے؟"

علی نواز کھڑکی سے باہر ایک اڑتے ہوئے بال کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے الفاظ نہ
 سن سکا۔

لڑکی دروازے کی طرف جانے لگی علی نواز بھی آہستہ آہستہ چلتے رہا۔
 دونوں دروازے کے باہر نک گئے۔

"بیٹی۔ یہ انسان بھی اللہ کی ایک عجیب مخلوق ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو جاتا
 ہے تو کسی نہ کسی ذریعے اسے پر کر لینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی کا پیاب ہو جاتا ہے اور کبھی لاکہ
 شاہد تم نے میری دلی کیفیت کا اندازہ لگایا ہو گا۔"

لڑکی نے اثبات میں سر ہا دیا اور چلنے لگی۔
 ”دیکھو بیٹی! ہو سکتا ہے تم پھر آؤ۔ میں تمیں کس نام سے بلانے لگاؤں گا؟“
 ”سانہ لڑکی نے کس قدر مسکرا کر کہا۔

جب وہ کمرے سے دروازہ لان میں پہنچی تو اس نے ٹھہر کر ایک لمحے کے لئے مغربی سمت دیکھا۔ علی نواز ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور جس وقت سانہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ اندر آ گیا۔ اس نے ایک کونے میں پڑے ہوئے سوٹ کپڑوں کو گھول پکڑوں کے نیچے لہاتہ ڈال کر ایک نصف نٹ لمبی اور اسکی قدر چوڑی فوٹو گراف نکالی اور کمری پر بٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ فوٹو گراف اس کے بیٹے اور بیوی کی تھی۔ بیوی کمری پر بیٹھی تھی اور اس کا بیٹا کمری کے پیچھے اپنی بیوی کے دونوں کندھوں کے اوپر دونوں ہاتھ رکھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس روز کے بعد سانہ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ”سرے سرے“ میں وہ لان میں سے گزرتے ہوئے علی نواز کے دروازے پر ضرور آتی تھی۔ اور اس کی خیریت دریافت کر کے بتی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ وہاں ٹھہرتی تھی مگر اس بہت کم وقت میں بھی تب وہی کے ہوا سے مریض کے اندر زندہ رہنے کی خواہش میں اضافہ کر دیتی تھی۔ ابھی تک علی نواز نے اس کے شہر کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملنے کی آرزو کا اظہار کرتا سانہ کہہ دیتی۔

”انکل! وہ خود آپ سے ملنے کے لئے تباہ ہیں۔“

”تو میں تمہارے ساتھ چلا ہوں“ علی نواز کہتا۔

نہیں انکل! ڈاکٹر نے آپ کو کل آرام کی ہدایت کی ہے۔ یہ نصف ہر کرنی ایسی خاص بات ہے جس سے وہ خوراک نہیں لے سکتے۔ یہ بات کہہ بھی چکے ہیں۔ اور ایک دو ہر کو سانہ یوسف کے ساتھ آ گئی۔

یوسف نے پھل سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھائے کھلی تھی اور سانہ کے ہاتھ میں تانہ اور شاداب پھولوں کا گلدستہ تھا۔ ان دونوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر علی نواز کی آنکھوں میں ایک

ایسی چمک آگنی جو اس کی دلی مسرت کا پتہ دے دہی تھی۔

یوسف کا لبہ لبہ بڑا شانہ تھا۔ طویل بہاری کی وجہ سے اس کے رخسار چمک گئے تھے اور آنکھوں کے ارد گرد گڑھے پڑ گئے تھے چہرے پر کہیں بھی سرخی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی تاہم جب اس نے علی نواز سے مصافحہ کیا تو علی نواز کو عسوس ہوا کہ وہ کافی توانا ہے مگر ہوشی سے اس کی انگلیوں کی گرفت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ وہ انداز میں بڑی کچھ دیر علی نواز سے باتیں کرتے رہے اور جب وضعت ہونے لگے تو علی نواز نے ایک ایسے لمحے میں جو نظرۂ ایک بائیں ہی کا ہوا سکتا ہے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یوسف! میں عسوس کر رہا ہوں جیسے یہاں اپنا بیٹا جو سات برس سے جہنمی میں ہے۔ اپنی بولی کے ساتھ واپس آ گیا ہے میری ادایاں دور ہو گئی ہیں، اور مجھے زندگی کی سچی خوشی مل گئی ہے۔“

یوسف نے ہلچکا۔

”انکل! کیا آپ کے بیٹے کو آپ کی علالت کا علم نہیں ہے؟“
علی نواز نے دیکھ بھری آواز میں جواب دیا۔

”نہیں میں نے اسے نہیں بتایا۔ اسے مجھ سے بے حد محبت ہے۔ بیماری کا ذکر کروں گا تو وہ مضطرب ہو کر واپس آ جائے گا۔ ایک لمبی عرصہ کے بعد اسے بڑا اچھا پانس ملا ہے یہ پانس حقائق نہیں ہوتا چاہیے مگر کوئی بات نہیں میری آس بہاں ہو گئی ہے۔ میری زندگی کا خطہ پتہ ہو گیا ہے۔“

”مگر انکل! اپنا خون اپنا خون ہوتا ہے میں وہ نہیں بن سکتا جو آپ کے لئے آپ کا بیٹا ہے تاہم مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھئے۔“

یوسف کی زبان سے یہ الفاظ سن کر علی نواز کی آنکھوں میں وقتی طور پر بالہ کی کاجوریاں سا لہرا رہا عقلا اس کی بجائے چمک دیک آگنی۔

اب یہ ہوا کہ سائرہ کو اس کے ہاں معمول کے مطابق آتی ہی رہتی تھی۔ یوسف بھی جیتے ہی ایک مرتبہ آنے لگا۔ ایسا ہونا درجہ تقریباً ایک ماہ تک اس کے بعد کئی روز کے بعد سائرہ آئی۔ علی نواز نے اسے دیکھا تو نہ جلنے اسے یہ احساس کیوں ہوا کہ وہ دیر سے ہواں کہ اسے کیوں سائرہ بیٹی ایک آئیں؟

ابھی آئی ہوں۔ آپ شاید کچھ سوچ رہے تھے۔۔۔ اور میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ وہ گھر چلے گئے ہیں۔

یوسف گھر چلا گیا ہے۔ الحمد للہ؟

علی نواز کچھ اور کہنے والا تھا کہ سائرہ کہنے لگی۔

”اس رات ایک جڑا SERIOUS کہیں آگیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ یہ سب سائرہ کا

تو۔ ٹھیک ہے۔ گھر جاسکتے ہو۔۔۔ اور یوسف نے فون کر کے کہہ دیے تھے۔ ہاں۔۔۔ ہم چلے گئے۔۔۔ اٹکل! یہ۔۔۔ اٹکل! آپ یہ نہ سوچیں کہ طے بغیر چلا گیا۔۔۔ بات۔۔۔ ایسی۔۔۔ ہو گئی تھی۔۔۔ اس نے ٹک ٹک کر فقرہ مکمل کیا۔ علی نواز سنا۔۔۔ جڑا۔۔۔ کی وجہ سے ٹک ٹک کر بات کر رہی ہے۔

نہیں بیٹی! ہرگز نہیں۔ میری حالت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے اسے بات پہلے پھرنے کی اجازت دے دیں گے۔ میں گھر جا کر تم دونوں کو اپنے دوں چلاؤں گا۔۔۔ اب ایک مہینہ تک تم وہیں رہو گے۔ کیوں بیٹی؟

سائرہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

دیکھو بیٹی! میرے بیٹے کو صحت روانی پر میری طرف سے ہزاروں چار کاہل میں دینا۔۔۔ تم دونوں کو سدا سکھی رکھئے۔

سائرہ سر جھٹکے کمرے کے باہر چلی گئی۔ علی نواز نے دیکھا کہ وہ اسی طرح سر جھٹکے چلی

جا رہی ہے۔

وہ ہر روز آتی تھی اور آکر بتاتی تھی۔ آج یوسف نے لمبی سیر کی ہے۔ آج اس نے پیٹ بھر کر اپنی من پسند چیزیں کھائی ہیں۔ اور صبح نواز کی صحت میں بڑی نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ اس کی صحت کافی حد تک عود کر آئی تھی۔ ڈاکٹر خدیجہ ان تھا کہ اس کی حالت میں ایسی خوشگوار تبدیلی کیسے آگئی ہے ؟

دوسرا آدمی صاحبہ گزریا تھا۔ کوہستانی علاقوں میں برہمنہ ہرف ہادی کے لئے مخصوص ہے ہسپتال کے لان میں آمدورفت خامی کم ہو گئی تھی۔ دو مہنتوں کے بعد ہرف گرنی رک گئی تھی تھا میں سینڈیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سفید یوں میں سورج کی کرنیں سونے کے تاروں کی طرح بکھر گئی تھیں۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ اور علی نواز کی حالت پہلے کی نسبت خامی بہتر ہو گئی تھی۔ اسے ہسپتال سے جانے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ مگر وہ حیران تھا کہ پچھلے پانچ روز سے ساڑھ کیوں نہیں آئی۔

اور پچھلے روز ساڑھ آگئی۔

اس کے چہرے پر ایک گہری اندرونی کشمکش کی کیفیت ظاہر تھی۔ وہ اند آئی اور وہ لو کے قریب چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ علی نواز سے دیکھ نہ سکا اور جب دیکھا تو اسے معلوم ہو گیا کہ ساڑھ دیر سے وہاں کھڑی تھی۔

”میں آج آپ سے کچھ کہنے کے لئے آئی ہوں۔ اس نے بڑے دھیمے بے میں کہا۔
علی نواز اس کے قریب ہو گیا۔

”کہو بیٹی ؟“

انکل : آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں نے پچھلے کئی دن اور کئی راتیں کس اضطراب اور کس میں کاٹی ہیں۔
وہ خاموش ہو گئی۔

”مگر کیوں بیٹی؟“

”میں۔۔۔ اٹکل! میں نے آپ کے ساتھ اور اپنے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔۔۔ وہ۔۔۔
یوسف۔۔۔ ہسپتال میں۔۔۔ ان کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی۔۔۔ ہم انہیں گھر لے گئے۔
۔۔۔ اور تین دن کے بعد وہ چل بسے۔۔۔ اٹکل میں آپ کو بتا نہ سکی۔۔۔ میں نے سوچا آپ
کو بڑا اشتیاق ہو گا۔ آپ کی صحت کو بڑا دھچکا لگے گا۔ آپ۔۔۔ اودہ اٹکل! میں نے
جھوٹ بولا۔ میں نے فریب۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مجھے کچھ دینا چاہیئے تھا۔
۔۔۔ پر۔۔۔ اٹکل، میری زبان ڈکی رہی۔ مجھے صاف کر دینیئے اٹکل۔۔۔ صاف کر دینیئے۔
سانرہ تیار و قطعہ رونے لگی اس کا بدن بڑی طرح کانپ رہا تھا۔
علی نواز آنکھیں جھپکاتے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

”اور نہیں بیٹی، تم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ کوئی دھوکا نہیں دیا۔ کیونکہ تمہاری
نیت نیک تھی۔ تمہارے اندر میرے لئے ہمدردی اور محبت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔
اور نہیں بیٹی، زندگی میں تو ہر ضلکسی نہ کسی طرح بڑھو جاتا ہے سانرہ بیٹی! میں آج نہیں بتا
ہوں۔ میں نے نہیں صرف یہی بتایا تھا کہ میرا بیٹا اور پوسٹ سالی سے جڑتی میں ہیں۔
سانرہ نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

”بیٹی، دو سال ہوئے وہ ایک کار کے حادثے میں مر گئے تھے۔“

”اٹکل!“

”وہ مر گئے تھے بیٹی۔“

اب سانرہ کے چہرے کا کرب ختم ہو گیا تھا اس کی جگہ ایک فری اور طاقت آگئی تھی۔
علی نواز نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کے سر پر رکھ دیا۔

بند گلی، بڑا مسد

اس گلی کا شمار لاہور کی اُن پانچ چھ گلیوں میں ہوتا تھا جو بڑی لمبی تھیں مگر اُس گلی کو تو یہ امتیازی شان بھی حاصل تھی کہ جب بازار سے اس کے اندر داخل ہوتے تھے تو دونوں طرف کھڑے ہوئے مکانوں کے دریاں کافی نامعلوم ہوتا تھا۔ مگر پھر جدید گلی تنگ ہوتی چلی جاتی تھی اور آخر میں تو اس قدر تنگ ہو جاتی تھی کہ دو آدمی بھی پہلو بہ پہلو چل کر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ۱۹۷۷ء سے پہلے اس گلی کی بیشتر آبادی غیر مسلم خاندانوں پر مشتمل تھی اور جو چند ایک مسلم گھرانے آباد تھے تو یہ وہ لوگ تھے جو سبزیوں اور پھل بیچتے تھے یا موچی، سوداگر اور دھڑی تھے۔ ان کی مکایں گلی کے اندر ہی مکمل درختوں اور آبادی کی اکثریت کے لئے ان کی حضرات میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

پاکستان قائم ہوا تو غیر مسلم آبادی اپنے مکانوں کو چھوڑ کر بھارت میں منتقل ہو گئی اور اس کی جگہ اس گلی کے خالی مکانوں میں مسلمان مہاجرین نے رہائش اختیار کر لی۔ اس مدت میں گلی کے اندر جو مسلمان رہتے تھے ان میں سے سولہ ایک بوڑھے بڑھئی اور بچے کے سب کے سب موقع سے غائب ہو گئے اور دوسرے گلیوں کے ایسے اچھے قابل مکانوں میں چلے گئے۔ اور یہی ایسا نہ کہ سکا ایک تو اس درجہ سے کہ اسے یہاں رہتے ہوئے کم درمیش نصف صدی گزر گئی تھی اور دوسری وجہ یہ کہ وہ تنہا تھا۔ تنہا آدمی کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

قیام پاکستان کے بعد اس گلی میں کوئی بڑا مکان اگر کہ اس کی جگہ یا مکان نہ بنایا گیا، البتہ مسلم آبادی نے گلی کی ایک ایسی عمارت کو جس میں پہلے رہنے والوں نے ایک ویڈیو گیم خانہ کر رکھا تھا

اسے حردی ترسیم کے بعد مسجد بنا دیا۔ ریڈ لگ روم کا مسجد بن جانا اوروں کے لئے مفید ثابت ہوا اور وہ اس طرح کوڑھاپے کی وجہ سے وہ اپنا دھندہ نہیں کر سکتا تھا بلکہ کتابت و تصانیف ہوتا۔ محلے کی مسجد کئی نے اسے پتیس روپے امانتخواہ پر مسجد کی صفائی کے لئے ملازم رکھ لیا اور یوں اسے زندگی کی بنیادی ضرورتیں پیدا کرنے کا ایک وسیلہ مل گیا جس پر وہ ہر طرح مطمئن تھا۔

گلی کے دو صوبے اپنے مکان گلی کے ان درکونوں میں واقع تھے جن کے آگے کئی گز کا ناقص چھوڑ کر سوک چلی گئی تھی۔ ان دونوں مکانوں میں تاجر پیشہ لوگ رہتے تھے۔ ایک مکان میں لدھیانے کا ایک خاندان آباد ہو گیا تھا جس کے سربراہ علی احمد انصاری تھے۔ اس کے با مقابل جو مکان کھڑا تھا۔ اس میں دلی کا کوئی تاجر آباد تھا۔

انصاری صاحب خالصے آسودہ حال تاجر تھے۔ تمام ہندی ہم جنھیں تدریعی طور پر ان کی نظر خوب سے خوب تر ہر ہٹی تھی۔ انہوں نے پہلے سعودی عرب میں جانے کی کوشش کی اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو خطر میں پلے گئے وہاں ان کا کاؤ بادر روز بروز وسیع ہوتا گیا تو انہوں نے آہستہ آہستہ یومی بیجوں کو بھی روپیں بھرا لیا اور مکان پر تالا لگا دیا کہ جب کبھی حالات نے واپس آنے پر مجبور کر دیا تو اس کو اپنا مکان بنا لیں گے۔

انصاری صاحب جب قطر پہنچے تو ان کو غالباً یہ توقع تھی کہ وہ تین چار سال کی مدت میں خوب دولت کا کر واپس آجائیں گے۔ لیکن وہ وہاں سے سعودی عرب جا پہنچے اور وہاں سے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ بیج اہل و عیال لٹان پہنچ گئے ہیں ان کا جو خط اسی کے تاجر دوست خان صاحب اکبر خان کے ہاں پہنچتا، اس میں وہ یہی بتاتے کہ میں وہاں ایک سال کی بات ہے وہ وہاں اپنے پرانے گھر میں آجائیں گے۔ لیکن چند سال بیت گئے اور ان کے آنے کا کوئی سال اور ہینڈ مقرر نہ ہو سکا۔

باتوں برس ضرور ہوا تو لاہور میں بے پناہ بارش ہوئی اگر انصاری صاحب مکان کے اندر موجود نہ تھے تو انہیں علم ہو جاتا کہ ان کے مکان کی بالائی منزل کی دیواروں پر جا بھا

خوافیں بڑھ گئی ہیں۔ فرضِ برہمت میں سے ہانی پک پک کر جمع ہو تا جا رہا ہے اور ایک دن جب بادش اپنے پورے عروج پر تھی، اس گلی کی فضا میں ایک ایسا دھماکا ہوا کہ سب کے دل دھل گئے ہر شخص کو روں محسوس ہوا جیسے اس کے ہمارے میں کوئی مکان گر چکا ہے جنوفِ روہت کے عالم میں زبانیں تلک سی ہو گئیں۔ پہلی تو سرشام ہی جا چکی تھی لیکن اندھیرے میں اصل حقیقت کا کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ پھر کچھ فوریان (تھیل) میں ٹاد چلے کر اپنے اپنے گھروں سے باہر آ گئے۔ معلوم ہوا انصاری صاحب کا مکان گر گیا ہے۔

آہستہ آہستہ لوگوں کے اوسان بھال ہونے لگے قریب ہی اتنا بڑا حادثہ ہو جائے تو لوگ سوکیو مگر کہتے ہیں۔ بہترین چاند گھروں کے مردہ اور عورتیں اکٹھے ہو کر یا الگ الگ ٹوہیوں میں اس واقعے پر اظہارِ خیال کرنے لگے۔

مکان گر پڑا تھا، مگر اطمینان کی صورت یہ تھی کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا کیونکہ جو دیوادیوں زمین بوس ہو گئی تھیں وہ گذشتہ سات برس سے اس خاندان کے افراد کی صحبت سے محروم ہو چکی تھیں جو ان کے درمیان رہتے تھے۔

صبح ہونے میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے کہ بادش ختم ہو گئی۔ لیکن ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی اور راجوں کی دھم روشنی میں صورت حال کا صحیح جائزہ نہیں لیا جاسکتا تھا۔ گلی کی مسجد میں خود انہوں نے اذان دی تو لوگ مسجد کی طرف رخ کرنے سے پہلے جانے حادثہ کی طرف جانے لگے۔ وہاں اور تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ انٹرن اور بے کے ڈیم سے وہ راستہ مسدود ہو گیا تھا جو بازار کی سڑک سے جاملتا تھا اور اس ڈیڑھ کو ہٹانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

پہلے دن جانے حادثہ پر لوگوں کا اتنا شدید حال کہ حرفِ گلی ہی کے نہیں ان محلوں سے بھی لوگ آتے جاتے رہے جنہیں انصاری صاحب کے مکان کے گرنے کی خبر ملی تھی۔ انہوں نے اس سے پیشتر بھی گرنے والے مکان دیکھے ہوں گے، مگر ایسی فطرت میں جو ایک غیر معمولی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش بھیجی رہتی ہے وہ انہیں وہاں جوتی جوتی آئے پر عبور کر رہی تھی۔ وہ جب

ادھر ادھر بکھری ہوئی اینٹوں کے علاوہ اپنے سامنے چھت کی گرمی ہوئی خستہ یوں، ٹٹے بھولے
فریج اور گھریلو استعمال کے برتنوں کو دیکھتے تھے تو نہ جانے اس منظر پر انہیں کیا کشش محسوس ہوئی
تھی کہ وہ لمبے سے نظریں ڈھٹا ان کے لئے مشکل ہو جاتا تھا۔

گلی کے سرے لوگ وہاں آکر واپس جا چکے تھے اور جو نہیں آئے تھے وہ کسی خاص مجبوری کی
وجہ سے گھروں سے باہر نہیں نکلے تھے، البتہ ایک شخص اس تھا جو نہ تو وہاں پہنچا اور نہ وہاں پہنچنا
چاہتا تھا، کیونکہ اس کے روزمرہ کے معمولات میں کبھی کسی قسم کی بے تاملگی نہیں ہوئی تھی اور
اس روز بھی وہ کسی بے تاملگی کو پسند نہ کر سکا وہ رات کی روٹی تو سے پرگرم کر کے اور اسے
چائے کے ساتھ کھا کر مسجد میں آ گیا تھا اور معمول کے مطابق اس کی مکانی میں معروف ہو چکا تھا
شریف سٹوائی کا بیٹا عنایت جب مسجد کے ستارے میں پہنچنے کے لئے آیا اور اس نے اردین
کو بدستور مسجد کے فرش پر گایا کپڑا بھیرتے ہوئے دیکھا تو بے چارہ

”چاچا! پتا ہے رات انصاری صاحب کا مکان گر پڑا تھا؟“

اردین نے اس کے جواب میں سر ہلایا۔

”دیکھا چاچا؟“

نہیں یہ کوئی تماشہ ہے؟“

”اے اور کچھ نہ بوجھا اور ستارے میں چلے گیا۔“

انصاری صاحب کا مکان کیا گرا تھا؟ تین دیسے ملے پیدا ہو گئے تھے جس کا شوق گلی کی اجتماعی
زندگی سے ہونا ایک فطری امر تھا۔ یہاں مسئلہ یہ تھا کہ انصاری صاحب کو اس حادثے کی اطلاع
کیونکر دی جائے، وہ مسئلہ یہ کہ جب تک وہ یہاں نہیں آتے ان کے سامان کا کیا کیا جائے۔
بہت سا سامان تو بٹے کے نیچے دب گیا تھا، مگر کچھ فریج اور برقی نکالے جا سکتے تھے۔ انہیں کہاں
اور کیسے رکھا جائے اور پھر مسئلہ تھا گلی کے اس حصے سے طلبہ بٹانا، کیونکہ طلبہ بٹانے بغیر گلی دلوں
کا بیرونی دنیائے کوئی رابطہ سہولت کے ساتھ برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ زمین کا وہ حصہ جو گلی کو بیرونی

سڑک سے ملا، تھوڑا دیر کا کام چلے سے ڈھک چکا تھا اور بے کے اوپر سے گزرتا ہوا
دو شوار کام تھا۔

اسی نام کو مسجد کہتی تھی گلی کے ایک دروازے اور اسے کی حیثیت حاصل تھی، کے صوفیان
صاحب کبرخان کے مکان میں گلی کے اہل الرائے افراد کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں یہ طے کیا
گیا کہ بے کو ہٹانا بہت ضروری ہے اس کی اطلاع خودی طور پر کارپوریشن کو دینی چاہیے۔
انصاری صاحب کو فوراً خط لکھ دینا چاہیے کہ ان کا مکان گر پڑا ہے، اگر اپنا سامان لے جائیں
خط لکھنے کی ذمہ داری خان صاحب نے برضا و رغبت قبول کر لی۔ کارپوریشن کو اطلاع دینے
کا فریضہ کئی کے سیکرٹری ذریعہ ٹھیکیدار کے حوالے کر دیا گیا۔

تین روز گزر گئے، مگر کارپوریشن کا ملا حرکت میں نہ آ سکا، تو گلی کے لوگوں نے کئی کے
صدر خان صاحب سے شکایت کی کہ ہماری وقت دور نہیں ہوئی، جس باہر نکلنے کے لئے گلی
کے دوسرے سرے پر جانا پڑتا ہے اور یہ کافی دور ہے، خان صاحب نے سیکرٹری کو بلا کر پوچھا،
”ٹھیکیدار صاحب، آپ نے کارپوریشن سے رابطہ قائم نہیں کیا؟“

ٹھیکیدار صاحب نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے دیتے تھے کہ وضاحت یوں کی

خان صاحب، کارپوریشن کو اطلاع دینا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے، ایک آدھ گھنٹہ
میں یہ کام کیا جاسکتا ہے، مگر میں سوچتا ہوں انصاری صاحب کا سامان سامان بے کے نیچے پڑا
ہے، اس سامان کے ساتھ گڑبڑ کا اندیشہ ہے، کل انصاری صاحب نے اگر پوچھا خان صاحب
کیا آپ میرے سامان کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ تو اس وقت جواب دینا مشکل ہو جانے لگا، بہتر
یہ ہے کہ براہ راست انصاری صاحب سے رابطہ قائم کیا جائے، اس طرح کل ہم پر کوئی اعتراض
نہیں ہوگا۔“

بات معقول تھی، کئی کے ارکان کی سمجھ میں آگئی، سب نے رائے دی،

”خان صاحب، آپ انصاری صاحب کو تارو سے دریں یا ان کا ٹیلیفون نمبر دریافت کر کے

ترنگ کر دیں۔ ٹھیکیدار صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ ہمیں یہ ہمام اپنے سر نہیں پہنا جائیے۔ تیسرے روز کبھی کی ٹینگ ہوئی تو خان صاحب نے جیاد میں نے بلی گرام بھیج دیا ہے۔ انصاری صاحب بلی گرام لے کر پھر آیا تھا۔

گلی والوں کی دقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کوئی بہار ہوتا تو گلی کے اندر سولہ کی بندوبست کرنا ناممکن تھا۔ بہار کو بڑی مشکل سے دوسرے راستے سے باہر لے جایا جاتا تھا اور وہاں جا کر تلگے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

گلی والے صبر و تحمل کے ساتھ یہ دقت برداشت کر رہے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ انصاری صاحب ہوائی جہاز میں بیٹھ کر فوراً آجائیں گے اور راستہ صاف کرادیں گے۔

چار دن گزر گئے۔ انہیں میں اضطراب اور بے چینی کے آثار محسوس کئے جانے لگے گلی کا ایک شخص دوسرے سے کہتا۔

چار دن گزر گئے ہیں، ہمارا تو ایک دن میں پہنچ جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کا سطر ایک دن کا نہ سہی ڈیڑھ دن کا بھی اب تک تو انصاری کو آ جانا چاہیے تھا۔

مناظر جواب دیتا،

”مذہب پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہ کیوں نہیں آیا؟“

خان صاحب جب بھی کسی غرض سے کہیں آتے جلتے تو ان سے سلام کے بعد یہی سوال کیا جاتا،

”خان صاحب جی! انصاری صاحب آجائیں گے ناں؟“

خان صاحب ایک ہی جواب دیتے،

”آئے گا۔ کیوں نہیں آئے گا؟ ان کے بچے میں وہاں باغض ہوتا۔“

ایک سچ گلی کے لوگ سو کر اٹھے تو انہوں نے ایک نئی خبر سنا لی۔ خبر یہ کہ انہوں نے

کسی نے انصاری صاحب کا سامان نکال لیا ہے۔ واقعی وہ شکستہ فریج اور تانبہ وغیرہ کے رشت

جھپٹے میں دھنسنے ہوئے ہر روز نظر کیا کرتے تھے اب غائب تھے۔ بے کے اور دگر پھر
تھا شاید انہوں کا مجرم ہونے لگا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے۔
”یہ سامان کون لے گیا؟“

یہ سوال سننے والا اپنی جھرت کے اظہار کے سرا اور کچھ نہ کر سکا۔
اس روز شریف اور بن رگزر مسجد کے قریب سے گزر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ
نور محمد ٹھیکیدار چاچا اور دین سے ہوئے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا اور الدین نے اپنے دائیں ہاتھ
کی انگلی آسمان کی طرف اٹھا رکھی ہے۔ شریف اور بن کسی نئی خبر کی امید میں وہیں ٹک
ر گئے۔ بتا دو لا۔

”ٹھیکیدار صاحب کوئی منتر پتا چلا؟“

ٹھیکیدار نے جواب دیا۔

”میں نے چاچے سے پوچھا ہے تم راتوں کو بہت کم سوتے ہو، گلی کی بڑکھیا اری کو تے رہتے
ہو۔ معلوم ہو گا نہیں یہ بد زالی کس نے کی ہے؟“

مزور پتا ہو گا جی کیوں چاچا؟

الدین نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ اس کی انگلی بدستور آسمان کی طرف
اٹھی ہوئی تھی۔

انہیں میں عنایت بھی آگیا۔ وہ سنی خبر انداز میں اپنا سر ہلارہا تھا اور اس کی آنکھیں کسی خاص
اکتشاف پر چمک رہی تھیں سارے گلی والے عنایت کو گپ باز کہتے تھے۔ اس کی بات پر
بہت کم اکتلا کر یا جاتا تھا اور شریف نے اس ٹڈ سے کہیں اس کا بیٹا کوئی سنی خبر سننا کہ
خواہ خواہ سنو نہ اٹھا دے۔ اس کو سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

بھرا باز آ جاؤ اپنی حرکتوں سے سنا تم نے؟

محمد عنایت نے جھٹ کہہ دیا۔

”افصاری صاحب کا سامان پتا نہیں کون لے گیا پریمیاں جی؟“

عنایت اپنے باپ کو یہاں ہی کہتا تھا۔ اس کے منہ سے پرکا لفظ نکل کر بتا رہا۔
”پترا پتا کیا معاملہ دالم ہے؟“

اب کے عنایت بتا سے غائب تھا،

”مختصر قلعی گڑ ڈھیر سارے برتن کس کے قلعی کر رہا ہے؟“

اس کے باپ اور بھئی نے اپنی نظروں عنایت کے چہرے پر جاریں، چادروں نظریں بڑی
بے تابی سے بوجھ رہی تھیں،

”کس کے برتن؟“

عنایت کی دھوئی ڈھیل ہو گئی تھی۔ اس نے اسے اپنی کمر پر کس کر باغھا اور ایک طرف
جاتے ہوئے کہنے لگا،

خان صاحب کے، ان کے مکان کے پچھوڑے دیکھو جا کر۔

شریف نے نوہرے خنوکا اور بیٹے سے کہا،

”چپ بیٹے بے شراں۔“

عنایت لے جاتے جاتے قہقہہ لگایا اور ایک طرف بھی نہ ٹھہرا۔ عجیب بات تھی اور ان کی
انگل اب بھی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی، ٹھیکیدار صاحب کہہ رہے تھے، دیکھو لیا شریف حیرا
بیٹا جیل میں جانے لگا۔

گلی والے خان صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ کئی گھروں میں تو ان کے گھر سے دزدان
سج لٹی کے بھرے ہوئے ڈول جاتے تھے۔ علامہ ازیں وہ مسجد کی موت کے کام میں سرگزی سے
حصہ لیتے رہتے تھے۔ ۲۰ بم بہ خیر جیلنا شروع ہو گئی۔

بھئی نے ابراہیم دزدی سے سرگوشی کی، ابراہیم نے عبدالکریم کھڑا بیٹے والے کے کان میں کہہ
دی عبدالکریم نے جمال مٹھائی فروش تک پہنچا دی، اور ہر ایک جب یہ خبر دوسرے پر اعتماد کرتے

ہوئے جتنا تھا تو ساتھ تاکیدا یہ بھی کہہ دیتا، یار! میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں، کسی اور کو ہرگز نہ بتاتا۔ اور رازداری کا یہ معاملہ اس طرح چلا کر خان صاحب کے کانوں میں بھی اس کی جھجک بڑھنی، جس شخص نے ان کو یہ بات بتائی تھی، اس کو قوتی تھی کہ وہ اس کے انتظام سنے ہی بھڑک اٹھیں گے اور عنایت کو بے خست کر کے رکھ دیں گے۔ مگر انہوں نے دو تین لمحوں کے لئے گدن جھجکا کر کچھ سرچا اور چنپ چاپ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے، خبر نہانے والے کی نظریں اس وقت تک ان کا تعاقب کرتی رہیں جب تک وہ گھر کے اندر نہ چلے گئے نام سے پہلے پہلے خان صاحب کے رد عمل کا بھی سراپا کر عظم ہو گیا ٹھیکیدار نور محمد کو اس کا عظم ہوا تو وہ دودھ کا خالی گلاس اپنی نوکرانی کو دیتے ہوئے ابراہیم سے کہنے لگا:

”ابراہیم! پتیلی میں پانی اُبل رہا ہے، ٹھیک کر پڑے گا۔ میں نے کہا جس تھا تعاقب جیل جیلے گا!“

”اچھا ٹھیکیدار جی!“

”دیکھ لینا، ہوتا کیسا ابراہیم! کسی پر الزام لگاتا آگ سے کھینا ہے، ضرور کچھ ہوگا۔“

اور اسی وقت بتے نے آکر بتایا:

”ٹھیکیدار جی! مسجد میں میٹنگ ہو رہی ہے، خان صاحب نے آپ کو بلا لیا ہے جلدی چلئے۔“

ٹھیکیدار نے ابراہیم کو اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، دیکھ لو میں نہ کہتا تھا مگر کچھ ہوگا

ابراہیم نے سر ہلکا کر اس کی تائید کر دی۔

مسجد میں اتنے لوگ جمع ہو چکے تھے کہ صحن بھر گیا تھا، خان صاحب دروازے کے ساتھ بیٹھ

دھکائے بیٹھے تھے، ان کے سامنے شریف کھڑا تھا جس کی گدن جھجکی ہوئی تھی، ٹھیکیدار بیٹھا، تو

ایک دم کئی آوازیں بلند ہو گئیں۔

”آئیے ٹھیکیدار صاحب!“

کئی لوگوں نے ان کے لئے اپنی جگہ خالی کر دی اور دروازہ کھڑے ہو گئے، خان صاحب نے

انہیں اپنے قریب بلایا اور جو لوگ اٹھ بیٹھے تھے وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

لوگ آپس میں کچھ کہہ رہے تھے۔ ٹھٹھا تھا ہر ایک دوسرے سے مرگنی کر رہا ہے۔ اتنے میں خان صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ مواصلہ لہرایا اور کہنے لگے: بھائیو! کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟ سب آوازیں گونج اٹھیں اچی ماں:

خان صاحب نے تھوک اپنے منہ سے نیچے ادا دی اور اپنے دائیں ہاتھ کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے کہے: میں نے نو دس برس آپ سب کی خدمت کی ہے اب سب نے مسجد کئی کا مجھے صدر چنا تھا، چنا تھا، یا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ چنا تھا، چنا تھا، ... آوازوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔

خان صاحب نے حاضرین کو غائب کر کے پوچھا،

”کبھی آپ نے مجھے بد دیا نئی کرتے ہوئے پایا ہے؟ نہیں نہیں؟“

”مگر آج مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ میں نے انصاری کے گھر سے برتن چرائے ہیں۔ اور لوگو! اللہ سے ڈرو، اللہ کی لاشی بے آواز ہوتی ہے۔“ یار رکھو۔۔۔“

شریف اور ایک آدم اٹھا کر خان صاحب کے قریب چلا گیا۔

خان صاحب جی: — میں سنا ہی مانگتا ہوں، ہاتھ جوڑتا ہوں، اور وہ ہاتھ جوڑ کر غور کرانے لگا۔

سنا ہی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں خان صاحب سے پوچھتا ہوں ان کے مکان کے پھر پھر اڑے تھو تھو تھو گرووں سے کس کے برتنی قلعی کر رہا ہے اور ابھی برتن ختم نہیں ہونے یہ سینکڑوں برتن آخر کہاں سے آئے ہیں؟

سب کی نظریں غلامیت کی طرف اٹھ گئیں وہ اس جگہ کھڑا تھا جہاں نمازی جوتے رکھتے ہیں۔ چُپ اور حرام زادے: شریف گرجا۔

عنایت نے باپ کے فتنے کا کوئی خیال نہ کیا۔ کہنے لگا:

انصاری صاحب کے مکان کے بلے میں جو برتن نظر آتے تھے وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں کیا خان صاحب بتائیں گے کہ ہفتے کی رات کران کی ایک نوکرانی اور دو نوکرہ حلاوتی برتن نکال کر نہیں لے گئے تھے؟ عنایت نے اپنا فقرہ مکمل کر کے چھوڑا اگرچہ اس کا باپ نہایت کٹھن چٹپ کر ہتھارہ۔

خان صاحب اس کٹھن جواب دیں: اپنے نے کہا۔

ہرگز نہیں۔ خان صاحب ایک آوارہ گرد، فرزدے دار، جھوٹے منکار، لوٹے کو جواب ہرگز نہیں دیں گے۔ ٹھیکیدار صاحب نے اٹھ کر پر جوش بچھے میں کہا۔

خان صاحب کو جواب دینے دیکھا: ابراہیم نے کہا۔

غصے، بالکل نہیں۔ جواب دینا خان صاحب کی توہین ہے؟ ٹھیکیدار خان صاحب کا پوری طرح دانا کر دیا تھا۔ اور خان صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ بڑے سکون کے ساتھ چلے تھے اور غصے، آبروریزیوں سے ٹھیکیدار کو دیکھ رہے تھے۔

عنایت بولا:

خان صاحب کہا ابھی بلے کے نیچے اور برتن اور قیمتی سامان لگا ہے۔ یہ کہہ کر وہ بڑی مڑا اور جانے لگا۔ ٹھیکیدار پکڑوا اس پر معاش کو، ہتھارہ گیا۔

ہینک ختم ہو گئی۔ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ اس ہینک کے ایک روز بعد۔

مسجد کے صحن میں شریف، ابراہیم اور خٹو بیٹھے تھے۔ شریف اور ابراہیم مسجد سے ہٹا کر وہیں جا رہے تھے کہ خٹو نظر آیا جو سامان صاحب کے مکان سے کچھ خاملے پر چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے اسے روکا اور امراہ کے مسجد میں لے آئے۔ وہ اس سے بار بار انصاری کے برتنوں کے بارے میں پوچھا۔ کہہ رہے تھے اور وہ تھا کہ صرف ایک ہی فقرہ رٹے جا رہا تھا۔

”برحق خان صاحب نے ویٹے تھے۔ میں اللہ جانے کس کے؟“

اس سے زیادہ اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور ابراہیم جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ جرتے ہیں راجھا کہنے لگا،

عنایت مجوری کر کے بال بچوں کا پیٹ بھرتا ہوں مجھے نہ گھسیٹو اس لئے میں ہاں کہہ دیا ہے۔ وہ یہ الفاظ کہہ کر چلا گیا۔ شریف اور ابراہیم ایک دوسرے کا ہنہ مکتے رہ گئے۔

شریف تو بچے کا کوئی دانتوں تلے دبانے لگا اور ابراہیم نے بغیر کسی مقصد کے صابن دہانی سے صابن نکالا اور اسے ناک کے پاس لے جا کر سو گھنٹے لگا۔ ان سے کچھ دور مسجد کے صحن کے کنارے اور یہاں ایک ٹوٹی ہوئی ڈبل اینٹ سے اس بکس کے کیل درست کر رہا تھا جس میں غازی جوتہ رکھ کر مسجد کے اندر نماز پڑھنے کے لئے جلتے تھے۔ انہماک کے عالم میں اس کے منہ سے تنوک بہہ کر داڑھی کے گرد آلود باؤں میں جذب ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہیں کبیں پر جمی تھیں اور نگاہیں اٹھا کر اسے شریف اور ابراہیم کی مسجودگی کا کوئی علم نہیں ہے۔

عنایت ہاتھ میں پتیل کا ایک ڈول نکالنے اندر آیا اور ایک ٹوٹی کھول کر اسے پانی سے بھر کر لگا شریف کی اس پر نظر پڑ گئی۔ غصے سے بولا،

”ابے شرواں۔ بے حیا دا؟“

عنایت نے ٹوٹی ہند کردی اور باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا،

”میں بے شرم کیوں ہوں؟“

”کر کیا رہا ہے؟ باپ نے پوچھا۔“

”کر کیا۔ امیوں، نیاز نے گاؤں کو لٹی بنا کر دی ہے، بولادیا ڈول میں دریا پانی تولے آ۔“

اس میں بے شرمی کیا ہے جیسا جی؟

اس سے پیشتر کہ شریف اپنے بیٹے سے مزید کچھ کہے ابراہیم نے کہا،

چترا یہ بے شرمی کا کام نہیں ہے جو تولے کل کیا تھا۔ تو یہ خان صاحب پر اتنا بڑا

الاحرام اللہ سے ڈرو پڑو:

غناہت کے ڈول ایک طرف رکھ دیا:
”میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“

”میں کہتا ہوں بک بک بندہ: شریف کا ہاتھ بے اختیار پاؤں کی طرف گیا، مگر جوتے تودہ صحن سے باہر اتار دیا تھا۔“

”میاں جی! اگر خان صاحب کہہ دیں کہ میں جھوٹا ہوں۔ یوں نہیں سر پر قرآن اٹھا کر۔
تو مجھے سات چودوں کی سزا دیں، آف نہیں کروں گا:“

شریف کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ اپنے بیٹے کو غوردار نظروں سے دیکھنے لگا۔
غناہت کے ڈول ایک ہاتھ میں اٹھا لیا۔

نبیاں جی: کل جوا نصابی آئے گا تو گلی کے لوگ اسے کیا سنہ دکھائیں گے، پوچھے گا یا رو!
میرے برتنوں اور چیزوں کی حفاظت بھی نہ کر سکے، سنہ دکھا سکیں گے؟“

غناہت چلا گیا۔ نصابی ایک سناٹا چھا گیا۔ شریف اور ابراہیم کی سوچتی ہوئی آنکھیں
جھک گئی تھیں۔ والدین کے ہاتھ سے لاسٹ گرے ہی مائل تھی۔ وہ اثبات میں سرعام نہ تھا۔
”شریف یا رب! ابراہیم نے اپنے دوست سے مرگوشی کی۔
شریف ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔“

نیلہ: تیرا تجربہ بات چیت کی کیا ہے یا ابراہیم؟ نصابی کو کیا سنہ دکھائیں گے؟
شریف کی کچھ کچھ جی نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے دوست کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔
”یہ مسلمان کون لے گیا؟ اس نے پوچھا۔“

ابراہیم ایک دھکے خا سرشہہ کر کہنے لگا۔

نیزا خیر کہتا ہے خان صاحب قرآن۔“

”اس حرام زادے کی بات چھوٹو:“

ابراہیم نفی میں سر ملانے لگا۔

”نہیں یاد! دال میں کچھ کالا ہے۔ پر چھوٹو میں کہتا ہوں انصاری کو کیا نہ دکھائیں گئے۔ کیا نہ دکھائیں گے۔ کیا نہ دکھائیں گے۔“ یہی رٹ لگا رکھی ہے، شریف کا پارہ برابر چڑھ رہا تھا، راستہ بند ہے، کوئی مرگیا تو جہانہ کیسے نکلے گا؟ اس نے فقرہ مکمل کیا۔ ابراہیم کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”شریف یاد! انصاری بڑا اچھا آدمی تھا۔ میری صفراں کا بیاہ ہوا تو پانچ سو روپے دے کر بولے یاد! کام چلا دیتی۔ بیٹی، میری بیٹی ہے۔ آکر کہے گا نہیں کہ برا مال اسباب کہاں گیا، تم لوگ اندھے ہو گئے، حقے! اپنے گھروں میں لے گئے ہو؟“

شریف ابراہیم کے آخری فقرے پر چونک پڑا۔ اس کے چہرے کی سرفی تبدیل ہو چکی ہوتی تھی۔ اچانک اس کی توجہ سٹالے کے اس بیلو پر چلی گئی جس کا اس سے پہلے اس نے خیال تک نہیں کیا تھا۔ کہنے لگا: ”ہم سب کو جو سمجھ لے گا۔ بہت بڑا ہو گا۔“ نٹھنوں کے متحرک ہونے سے اس کی سوجھیں کا منہ سی رہی تھیں۔

اردوین نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ اس نے ایسٹ مسجد کی دیوار کے ساتھ لگا دی۔ کچس اٹھا کر دوسرے کونے میں نکال دیا، شریف اور ابراہیم کے جوتے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کے اندر رکھ دیئے اور اندر آنے لگا۔ وہ ان دونوں کے قریب آیا تو ٹھہر گیا۔

”ڈرو، ڈرو، اوپر والے سے ڈرو، اوپر والا سب کچ رکھ رہا ہے۔“

دونوں نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا وہ آہستہ آہستہ سخن میں سے گزرتا ہوا مسجد کے آخری حصے میں چلا گیا اور جب باہر آیا تو اس نے پندرہ بیس کے قریب تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں اٹھا رکھی تھیں جنہیں وہ ایک ایک کر کے مسجد میں لٹکی ہوئی مسلوں پر رکھنے لگا۔ میں تو کہتا ہوں شریف یاد خود بھٹ کرتے ہیں۔ بلکہ کھود کر چیزیں نکالتے ہیں، تہاڑے گھر میں یا میرے گھر میں پڑی رہیں گی۔ کسی دن تو انصاری آجی جائے گا، ابراہیم نے کہا۔

شریف نے کوئی جواب نہ دیا، مگر اس کے چہرے کا تاثر تار بامعنا کو اسے یہ تجویز پہنچا رہا ہے۔ والدین نے آخری فریاد ایک جگہ رکھی اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتا ہوا پھر اٹھ چلا گیا۔

شریف اور ابراہیم نے دوسروں کو اپنے ساتھ لانے کے لئے کچھ قابل اعتماد لوگوں کو اپنی تحریز تیار کی۔ جس نے یہ تجویز مٹی اسی نے تائید کی اور عملی طور پر اس میں حصہ لینے کیلئے تیار ہو گیا۔ ٹھیکیدار کو بھی اس تحریز کا پتا چل گیا۔ خان صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس سے ہنرمیں نہیں مل سکتا تھا، فوراً خان صاحب کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، "خان صاحب جی: اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انصاری کے برتن و برتن آپ ہی سے گئے ہیں اور باقی چیزوں کو وہ آپ سے پکانا چاہتے ہیں، اللہ کی لعنت اللہ پر، آپ کی توفیق کرتے ہیں۔"

خان صاحب کے ہونٹ لرزنے لگے، وہ جوابات کہنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ ٹھیکیدار نے کہہ دی تھی۔

"یہ پھل ہے دس سال کی خدمت کا، آپ نے لگی دالوں کی اتنی خدمت کی اور آج اس خدمت کا صلہ مل رہا ہے۔"

"یہی خدمت کا پھل ہے، خان صاحب بڑے۔"

ٹھیکیدار، خان صاحب کے اور قریب ہو گیا:

"برخاں صاحب! ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں، آئے کون ہائی کا لال آتا ہے، ملے ہٹانے، ہم مرنے لگے، خان صاحب! مرا چکھا دیں گے۔"

اس روز دوبارہ کے وقت شریف ابراہیم، بنا عینیت اور چھ اور آدمی کہ ایس اور بیٹے وغیرہ لئے کھنڈر کی طرف جا رہے تھے۔ گلی کے مکانوں کی کھڑکیوں سے عورتیں انہیں دیکھ رہی تھیں اور وہ بھی بار بار اپنی نگاہیں اوپر اٹھا دیتے تھے۔ انہیں جرت ہوئی تھی کہ عورتیں نسکا

کیوں رہی ہیں۔ اور اس سکاہٹ کا راز جلد ہی ظاہر ہو گیا۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ بے کے اوپر ٹھیکیدار اور دس بارہ آدمی ڈانگیں، جھڑپیں اور ایشیں ہاتھوں میں لئے کھڑے ہیں ٹھیکیدار نے انہیں آگے دیکھا تو ہلکا کر کہا:

”خبردار جو کسی نے ایسی ویسی حرکت کی۔ چلے جاؤ۔ خون خرابہ ہو جائے گا۔“

مغریف ابراہیم اور دوسرے لوگوں کو اس حادثے کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ وہ حیران ہو گئے۔
 ”یادو! ہم خون خرابہ کسے لئے ہیں آئے یا ابراہیم نے بلند آواز سے کہا۔
 ”پھر کیا کرنے آئے ہو؟ ٹھیکیدار کی آواز گونجی۔“

”ٹھیکیدار جی ہم تو ایک نیک کام کرنے آئے ہیں۔ ہم تو لب صاف کرنے آئے ہیں۔ کوئی بیچارہ بڑتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ رکھے کوئی مر گیا تو۔“ ٹھیکیدار اگے بڑھا اور کہنے لگا:

”بھو! کسے ہو، تم نے ہمارے خان صاحب پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ میں کہتا ہوں عزالت اسی میں ہے کہ فوراً چلے جاؤ۔“

ابراہیم اور اس کے ساتھی متذہب حالت میں کھڑے تھے۔ عنایت آگے بڑھ گیا۔

”ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ ہم لب صاف نہیں گے۔ ہم۔“

عنایت اوپر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ میں ریل پکڑ رکھا تھا۔

ٹھیکیدار نے گرج کر کہا:

”دفع ہوتے ہو یا نہیں؟“

”نہیں۔ لب صاف ہو گا۔ آت ہی صاف ہو گا۔“

”اچھا تو لو۔“ اور ٹھیکیدار نے اپنی ڈانگ گھمانی جو عنایت کے پیچھے کے ساتھ زور سے

ٹھکانی۔ ریل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔

”کھڑے کھڑے ہو بی جاؤں گا ذلیل کئے؟“ ٹھیکیدار نے اس کا حربہ بان پکڑ لیا۔

شریف کے اندر باپ کی محبت نے جوش مارا اور وہ ابراہیم سے ہاتھ چھڑا کر اوپر جانے لگا۔
 عنایت کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی تھی۔
 ٹھیکیدار نے شریف کو اوپر آتے دیکھا تو عنایت کو اس کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ
 روکھوتا ہوا باپ کے پاؤں پر آگرا ابراہیم بھی اوپر جانے لگا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیوں سے
 جو عورتیں جھانک رہی تھیں انہوں نے بے تحاشا جیننا شروع کر دیا تھا۔
 "خدا کے لئے روکو۔ خدا کے لئے روکو۔"
 ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

بچے وہ لوگ کھڑے تھے جو اس سائے میں غیر جانبدار تھے اور محض تماشا دیکھنے کے لئے
 آئے تھے۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اوپر جانے والوں کو روک دیا۔ آدھ گھنٹے بعد
 طرہین کے افراد ایک دوسرے کو نوٹنوار نظروں سے گھورتے ہوئے واپس جانے لگے۔
 ٹھیکیدار جاتے ہوئے پہنچ دے گیا۔
 ایک ایک سے پت لوں گا!

یہ کہتے ہوئے اس نے دایاں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرا۔
 ساری گلی کی نظارہ خیز و دہشت کی گہری دھند چھا گئی تھی۔ عورتوں نے مردوں کے
 اندر آتے ہی وردازے بند کر دیئے تھے اور شام ہوتے ہی سرد تیز دھند ہوا بھی چلنے لگی تھی۔
 تمام رات تیز ہوا کا شور برپا رہا۔

صبح ہونے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا کہ ہوا کی طوفانی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ اور
 پھر جب مسجد سے صبح کی اذان گونجنے لگی تو سب سے پہلے مسجد میں جانے کے لئے شریف
 بچے اترے۔ ساری رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سُرجھی ہوئی تھیں۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے یونہی اس کی نظر لمبے پر جا پڑی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں کوئی
 سیاہ سی چیز پڑی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“

اس نے اپنے دل سے سوال کیا اور لمبے کی طرف جانے لگا۔

اب ابراہیم بھی نیچے اُتر آیا تھا۔

”ابراہیم! وہ کیا ہے؟“ اس نے سیاہ چمڑکی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہے؟“ ابراہیم نے کہا۔

دو دنوں لمبے پیرسیخ گئے۔ انہوں نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا کہ لمبے کھودنے سے

ایک وسیع گڑھا بن گیا ہے اور اس کے قریب الدین اوندھے منہ گرا ہوا ہے۔ بیلچہ اس کے

ہاتھ میں ہے۔

ابراہیم نے جھک کر اسے دو تین بار بلایا۔ غریب نے اسے بلایا۔ گروہ بے حس و حرکت

پڑا تھا۔

لوگ آتے گئے، لاش کو دیکھتے گئے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔

لاش ہٹائی گئی۔ گلی کے بڑوں اور بچوں نے شام سے پہلے پہلے صاف کر دیا اور

رات کے پہلے پھر جب الدین کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے حرف گلی ہی کے نہیں اور گرو

کے علاقوں کے لوگ بھی عقیدت و احترام سے سر جھکانے چلے جا رہے تھے اور جنازہ ایک

ہمواد راستے سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا۔

ریڑھی

نیردڑ کو باپ کی موت کے بعد وراثت میں نہ تو کوئی قطعہ زمین ملا تھا، نہ مکان اور نہ کچھ نقدی۔ صرف ایک چیز لی تھی اور یہ بھی ایک پرانی ریڑھی جو اس کے باپ کے لئے بھی روٹی کمانے کا واحد آسرا تھی اور اس کے لئے بھی ذریعہ معاش بن چکی تھی۔

اس نے باپ کو کوئی بار تاروں کی پھاڑوں میں ریڑھی کو گھر سے باہر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور بیویوں مرتبہ یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ اس ریڑھی پر طرح طرح کی سبزیاں رکھ کر چرمان روڈ سے باہر اسلام پورہ کی سڑکوں پر ریڑھی کے ساتھ گھومتا پھر رہا ہے مگر یہ خیال کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ ایک روز وہ بھی اسی طرح سڑکوں اور بازاروں میں سبزیوں سے بھری ہوئی ریڑھی دھکیلنے پر مجبور ہو جائے گا۔

اپنا بچپن اور لڑکپن اس نے چرمان روڈ سے متصل ملت روڈ پر گزرا تھا جہاں ایک گلی میں وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ چشتی جماعت میں اس نے سکول سے اپنا تعلق قطع کر لیا تھا اور یہ واقعہ اس روز ہوا تھا جب اس کے تحت گیارہ ماہ بچے بننے کی یاد نہ کرنے پر اس کی بڑی طرح پٹائی کی تھی اور وہ دوتا ہوا زخمی حالت میں گھر پہنچا تھا اس کے بعد سکول کے نام ہی سے اس پر لڑھکھٹا ہوا تھا اور ماں باپ کے بے حد اصرار کے باوجود اس نے سکول کی طرف زرخ نہ پھیرا۔ ماں باپ کیا کرتے۔ ان کا قوی چاہتا تھا کہ ان کا بیٹا کوئی عزت و آبرو کی نوکری کرے مگر یہ اس کی قسمت ہی میں نہیں تھی۔

باپ نے اُسے ایک کھاتہ مرچنٹ کی دکان پر بٹھا دیا کہ کسی روز اپنے پیروں پر کھڑا ہو

جانے گا لیکن اس کا دل یہاں نہ تھا۔ صبح سے لے کر شام تک ایک جگہ بیٹھے رہنا یا گاہکوں کے سامنے تھکان کھول کھول کر قیامت برپا کرنا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ وہ وہاں ایک مہینہ بھی نہ گزار سکا اور دکان پریشہ کے لئے چھوڑ کر گھر آ گیا۔

باپ نے کئی اور دکانوں پر بھی اسے بھیجا مگر تک کر بیٹھنا اس کے پس کا روگ نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ باپ اس سے ایسے ہو گیا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد تین برس کی مدت اس طرح بیتی کہ فیروز کا باپ ریڑھی لے کر تباہ منڈی جاتا کیونکہ اس وقت فیروز سویا ہوا مگر جب منڈی سے واپس آتا تو بیٹے کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتا۔ فیروز ریڑھی کے ساتھ ساتھ چلتا، کسی گھر کے دروازے پر کوئی عورت کوئی ترکاری طلب کرتی تو یہ ڈیوٹی فیروز کی ہوتی کہ وہ ترکاری تمنا کر عورت کے حوالے کرے اور اس سے پیسے وصول کر کے باپ کو لاکر دے!

اس کام سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن باپ بوڑھا ہو گیا تھا۔ ریڑھی کو دھکیلے رہنا اس کے لئے زیادہ مشکل کام نہیں تھا مگر اپنی سبزیوں کا بار بار اعلان کرنا اور لوگوں کو ان کی خریدنا دہی سے مطلع کرنا اس کے لئے قدرے دشوار امر ہو گیا تھا۔ یہ فرض بھی فیروز ادا کرتا تھا جیسے ہی ریڑھی گھر کے قریب پہنچتی اور باپ پہلی آواز لگاتا کہ گویا، مٹھا، آلو، تازہ سبزیاں۔۔۔ تو وہ مجبوراً بستر سے نکل کر باہر آ جاتا اور دوسری آواز اس کے حلق سے نکلتی۔

باپ بیٹا گھر میں ناشتہ نہیں کرتے تھے۔ سولا داد کی دکان پر نان سری پالے اڑاتے۔۔۔ بس یہی ایک ایسی شے تھی جس سے فیروز کو دلچسپی تھی۔

بوڑھا باپ طرح طرح کی بیماریاں پال رہا تھا۔ اور یہی بیماریاں تیزی سے اسے قبر کے قریب لے جا رہی تھیں اور آخر کار لے ہی گئیں۔ ماں بھی چھ ماہ کے بعد دنیا سے چلی گئی۔

باپ کے مرنے پر تو فیروز کی ماں نے ایک ایک پیسہ جو کہ جو رقم جمع کی تھی اس سے گزراوقات ہوتی رہی۔ وہ مر گئی تو فیروز بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ ماں جاتے ہوئے اسے ڈیڑھ سو

دو ہسٹے گئی تھی، اس میں سے دو ماہ کا کرایہ دینے کے بعد فیروز کی جیب میں چھیانوے روپے بچ گئے تھے۔ وہ دو گھر میں بیٹھا تو بیس روپے اور خرچ ہو گئے، محلے کے بزرگوں نے سمجھایا: فوجے! خرچ کرنے سے تو تادوں کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ کچھ کام کاج کر۔ کب تک گھر میں بیٹھا رہے گا! یہ سالہ ہی ایسا تھا کہ فیروز اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ حاجی غلام جیلانی کا شاندار مکان اس کے گھر کے قریب واقع تھا اور حاجی صاحب کی دودکانیں تھیں، اور دونوں میں سبزیاں کبھی نہیں۔ فیروز کا باپ جب بھی اپنے کسی گاہک سے سنتا تھا: حاجی جی! ترکاری بہت سہی، بیچتے ہو: تو وہ بڑی حقارت سے کہتے تھے: یہاں صاحب! سنسنی کھانی ہے تو جلال کی ریڑھی پر جاؤ! یہاں جیسی سبزی ہوگی ویسے دام ہونگے۔ یہ حاجی صاحب ایک روز فیروز سے ملے اور بولے:

”فوجے! باپ کی طرح ریڑھی چلنے لگا یا بھلے، انہوں کی طرح میری دکان پر کام کر لے! حاجی صاحب نے گویا اس کے مرحوم باپ کو بھلے انہوں کی فرست سے خارج کر دیا تھا۔ اس نے باپ کی توہین غصے کی گھریہ نہر پچکے سے پی گیا اور دل ب سے بولا۔“

”حاجی جی! مہربانی!“

حاجی صاحب سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

وہ گھرا آیا تو اپنی چار پائی پر گر پڑا۔ اس کے سر میں درد تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد درد میں آفتادہ ہوا تو اس نے اٹھ کر گھر کے میں سے گلاس بھر کر پانی پیلا۔ گلاس گھر کے پردہ کو دھکا کر اس کی نظر ریڑھی پر پڑی جو اس کے باپ کی چار پائی کے قریب پڑی تھی۔ اس کا باپ اپنی ریڑھی سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر کے اندر رکھنے میں گھردلوں کو چلنے پھرنے میں کافی دقت ہوتی تھی اور فیروز کی ماں نے کئی بار اس کے باپ سے بھی امراد کیا تھا۔

فوجے کے لبا اسے باہر نکال کر دیا۔ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتی ہوں۔ کوئی چور نہیں

سے جانے لگا:

فیروز کے باپ کو یہ ڈر نہیں تھا کہ ریڑھی کو کوئی چر کرے جانے لگا لیکن ایک قواسی
بارش سے خراب ہو جانے کا خدشہ تھا اور دوسرا ڈر یہ بھی تھا کہ بھلے کے بچے اس کے اوپر چڑھ
کر اور جسم چپائیں گے اور اس کا ستیا مان کر دیں گے۔ اس لئے وہ پوری کی بات ماننے کے لئے
تیار نہیں تھا اور نہ ہی کبھی تیار ہوا۔

یہ ریڑھی اس کے باپ نے اپنی جوانی کے عالم میں خریدی تھی اور چونکہ اسے بہت
حفاظت اور احتیاط سے رکھا تھا۔ اور دو تین بار رنگ و دھن بھی کر دیا تھا۔ وہ پرانی
دکھائی نہیں دیتی تھی بلکہ گستاخا کہ صرف تین ماہ پہلے جوانی لگی ہے۔

وہ کئی لمحے نیچکی باندھ کر ریڑھی کو دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے اس کے مرحوم باپ کی شکل
پھرنے لگی۔ وہ بڑھاپے میں کتنی وقت سے ریڑھی دیکھ کر کھیل کھیل کر آگے لے جاتا تھا اور جب
کسی کو اپنی طرف آنے ہوئے دیکھتا تھا تو فوراً رک جاتا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں وہ الفاظ
بھی گونجنے لگے جو وہ ریڑھی کے ساتھ چلتے ہوئے بلند آواز میں کہتا تھا۔ گر بھی، آلو، ستر تانہ
سبزیاں یہ آواز سن کر اور گرد کے گھروں کے دروازے کھلنے لگتے تھے اور ان دروازوں پر
عورتیں اور بچے ٹوکیاں اٹھائے آ جاتے تھے اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بازار
میں سے گزر رہا ہے اور گھروں کے دروازے کھل رہے ہیں۔

وہ چار پائی سے اٹھ بیٹھا۔ ریڑھی کے پاس گیا اور بغیر ارادے کے اس پر ہاتھ پھرنے
لگا۔ شفاف ٹکڑی کے لمس سے اس کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جیسے وہ ٹکڑی ایک
جاندار وجود ہو جو سوالیہ نظروں سے اسے مسلسل دیکھ رہا ہو۔

اس نے جیب میں لمٹھ ڈالا اور ساری نقدی نکال کر ریڑھی پر ڈھیر کر دی۔ مایوسی کے
عالم میں اس کے چہرے پر سیاہ سائے سے منڈلانے لگے۔ وہ ریڑھی سے الگ ہو کر ٹکڑی داسہ
الہاری کے قریب چلا گیا وہ کبھی کبھی دیکھا کرتا کہ اس کی ماں اس الہاری کے سب سے پختلے

خلنے میں کپڑوں کے نیچے سے ایک میلا پھیلا ردال نکالا کرتی اور اس کی گانٹھ کھول کر ایک روپیہ نکال کر اسے دے دیتی اور پھر گانٹھ باندھ کر ردال کو وہیں رکھ دیتی جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔

یہ روپیہ وہ اپنے شوہر سے چھپی بیٹے کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کے لئے دیا کرتی تھی، جلال کو اپنی بوری کی بر حرکت پسند نہیں تھی، وہ کہا کرتا تھا: عیثاں! یہ فضول خرچی ہے جہاں مال کا ناخاک نہیں اور تم اسے پورا ایک روپیہ دے دیتی ہو گو عیثاں بیٹے کو ناپسند نہیں کرتی تھی۔

فیروز نے امادی کھولی ماں کی ذمات کے بعد اس نے کئی بار کپڑے نکالنے کے لئے یہ امادی کھولی تھی لیکن ردال کی طرف کبھی اس کا خیال نہیں گیا تھا اس نے ہم دور جا کی حالت میں سب سے پہلے خلعے کے کپڑوں میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہی لمحے میں وہی میلا پھیلا ردال اس کے ہاتھ میں تھا۔

ردال میں گانٹھ دیکھ کر اس کا دل بیوں اچھلنے لگا بے صبری سے اس نے گانٹھ کھولی۔ چند نوٹ نظر آنے لگے یہ نوٹ گن کر اس نے نقدی کے اوپر رکھ دیئے اور ردال اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ان نوٹوں نے نقدی میں چالیس روپے کا اضافہ کر دیا تھا۔
”اماں تم کتنی ابھی تھیں“

اس کے یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے اور اسے اچانک یہ سوچ کر پیشانی ہونی کر اس نے اپنی ماں کو کوئی شک نہیں دیا تھا۔

دوسرے روز علی الصبح جب ٹھیکیدار علی احمد کے مرنے نے باگ دی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس صبح اس نے اپنے باپ کی طرح سارے کام کئے پہلے ایک کپڑے سے رزنی کو صاف کیا، پھر کپڑا گیلہ کر کے اس پر پھیلا۔ دو دانے کے دونوں ہٹ کھوئے۔ ریڑھی کو باہر لے آیا

اور دروازے کو قفل کر دیا۔

جب اس کے ماں باپ زندہ تھے تو جس وقت اس کا باپ ریڑھی کو دروازے سے باہر نکالتا تھا۔ تو اس کی ماں غرور دروازے پر آ جاتی تھی اور تین چار مرتبہ زبا خیر کریں۔ کہتی تھی اور اس وقت تک دروازے پر کھڑی رہتی تھی جب تک اس کا غرہر گلی کے آخر تک نہ پہنچ جاتا تھا۔ اب کوئی زبا خیر کریں۔ کہنے والا نہیں تھا۔ دکھ کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔

سولا دار کی دکان میں ٹول پر بیٹھ کر جب اس نے غم مان کا لہو توڑ کر خریدے میں ڈالا تو اسے جہانی کا ایسا احساس ہوا کہ وہ کئی لمحے لقمہ تک نہ لے سکا۔

گھنے ڈیرہ گھنے کے بعد وہ زور لگا کر بازاروں میں ریڑھی دھکیل رہا تھا سبزی منڈی سے بھری رقم خرچ کر کے وہ جتنی ترکاریاں خریدا کر لایا تھا ان سے ریڑھی اس طرح بھری نہیں تھی جس طرح اس کے باپ کے زمانے میں بھر جایا کرتی تھی۔

بازاروں سے گزرتے وقت اس کے کانوں میں غیب غیب آوازیں آرہی تھیں۔

”اللہ تیری شان۔ واہ وا! گلیا باپ کے دلتے پڑے۔ سہان اللہ کا ڈیٹا آیا ہے۔“

ٹھیکیدار علی احمد نے اسے دیکھا تو دھوپ کی وجہ سے آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے بولا۔
”پھنس گئے بیٹا! پیٹ بڑی بلا ہے۔“

باپ کی زندگی میں جب ریڑھی کسی بازار میں سے گزرتی تھی تو ادھر ادھر کے گھروں کے دروازے کھلے گئے تھے مگر اب شادو ناوہ ہی کوئی دروازہ کھلتا تھا۔

ایک بجے کے قریب اس کی ریڑھی پر صرف چند خراب آلوؤں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا اور وہ خوش تھا۔ !

اس کے گھر سے کچھ نا میلے پر اماں شاماں کا نور تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ اس نور سے روشنی کھایا کرتا تھا۔

غور کے پاس آکر اس نے ریڑھی اٹھ جوا ایک مکان کی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور اپنے کرتے کی دونوں بھری ہوئی بیبوں کے ساتھ اس پیٹے پرانے بورے کی طرف قدم اٹھانے لگا جس پر مزدور اور غریب غریبا بیٹھ کر بیٹ بھڑکتے تھے۔

پیٹ بھر کر وہ ریڑھی لے کر گھر کے آگے جاڑکا جیب سے چابل نکالی۔ دروازہ کھولا اور آہستہ آہستہ ریڑھی کو اندر لے گیا۔

گھڑے سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کر ایک ہی سانس میں پی گیا اور بارہا پی دیں۔ جیسے ریڑھی پر خالی کر دیں۔ رقم گنی تو انیس روپے چار آنے کا منافع ہوا تھا۔ باپ کے زمانے میں یہ نفع اصل رقم سے بھی بڑھ جاتا تھا تاہم وہ خوش تھا۔

اس کے محلہ والوں کو یقین تھا کہ یہ گانا زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک رہے گا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر افسوس ہوتے جا رہے تھے کہ فیروز نے باپ کی جگہ لی تھی اور وہ باپ کی سہی مستعدی کے ساتھ کام کر رہا تھا اس کی ماں کا پرانا روال جراب اس کی جیب سے نکل کر امدادی کے سب سے پچھلے خانے میں کپڑے کے نیچے چھپا رہا تھا اس میں ایک کی بجائے چار گانے تھے۔ پڑی تھیں ماں گانوں کے اندر نوٹ تھے۔ کتنے وہ انگ کانسی کے ایک ایسے برتن میں ڈالتا جاتا تھا جہاں کی چار پائی کے قریب ایک طلبہ میں اس مقصد کے لئے رکھا رہتا تھا۔

پانچ بیسے گزرنے پر اس کی وہی حالت ہو گئی جو اس کے باپ کی تھی۔ اب منڈی میں ترکاریاں لے کر بانڈوں میں سے گزرتا تھا تو مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر عورتوں اور بچوں کے چہرے نظر آنے لگے تھے اور بارہا بکے تک ساری ریڑھی خالی ہو جاتی تھی۔ گھر واپس جاتا تھا تو ایک ان جانی آدمی اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی۔ فیروز سے پیٹ بھرنے کے بعد وہ کبھی غور سے کی دکان پر جا بیٹھتا تھا اور کبھی تعمیر طرہوں کی دکان کے پاس اس پنج پر جو گاہکوں کے لئے مخصوص تھا، نیم دراز ہو جاتا تھا۔ شام تک اسی طرح وقت

بتا کر وہ پھر تودے سے روٹی کھانے کے بعد گھر آکر چار ماہی پر لیٹ جاتا تھا اور گھنٹے آدھ گھنٹے تک کرڈ میں بدلتے کے بعد سو جاتا تھا۔

دن پر دن بیت رہے تھے اور اس کی والدی کے سب سے پچھلے خلعے میں کپڑوں کے نیچے نوٹ، ہی نوٹ بکھرے پڑے تھے یہ ان نوٹوں کے علاوہ تھے جو وہ مال کے چاندوں کو فوں میں بندھے ہوئے تھے۔

اس روز غفور سے کی مکان پر کوئی گلاہ نہیں تھا اور فیروز اس کے قریب سٹول پر بیٹھا تھا۔ غفور نے مسمیٰ نیز نظروں سے اسے دیکھا اور خود بخود سکوانے لگا۔

فیروز اس کی سکواہٹ کا مطلب نہ کچھ سکا۔ بوللا:

”کیوں غفور سے بات کیا ہے؟“

غفور ا کہنے لگا۔

”یہ اپنی دیر ٹھیک ہے، اپنے پاس؟“

”کیا پیسہ دیر؟“ اس اللہ کا فضل ہے۔“

”تو روں کی روٹیاں کھاتے کھاتے بے زار نہیں ہو گئے۔“ میں تو دس روپے بھی

نہیں کاتا، صاحب میری شادی ہو گئی تھی۔“ کہو تو کچھ کروں؟“

”کیا کرو گے؟“ فیروز نے اس کی پوچھا۔

”یہ بات ہم پر چھوڑ دو۔“

اور دوسرے روز مانی حیدواں اس کے گھر میں رضی تھی اور وہ جانتا تھا کہ مانی کا کام رشتے میں کدانا ہے اور غفور نے اسے اس کے گھر بھیجا ہے۔

حیدواں نے باتوں باتوں میں کچھ لیا تھا کہ آسامی ابھی ہے۔ کسی غریب گھرانے کی لڑکی اس کے گھر آکر اپنے ماں باپ کی محتاج نہیں رہے گی۔ خود ڈی دیر بعد رشتے ہوئے ہوئی۔

”بس ٹھیک ہے۔“ غفور نے کہا، ”اللہ نے چاہا تو میرے بیسی لڑکی ملاں گی تو ہمارے لئے۔“

اب ذرا منہ میٹھا کرادے :

وہ بھوکا تھا کہ حیدر کچھ مانگ رہی ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کتنے روپے مناسب رہیں گے حیدر نے اس کا چہرہ دیکھ کر بھانپ لیا کہ کیا سوچ رہا ہے۔

”پندرہ برس تو دے دے نا۔“

اس نے ایک لفظ کہے بغیر عجیب سے برس روپے نکالے اور حیدر کے حوالے کر دیئے اور وہ رعائش دیتی ہوئی پتلی گئی۔

چوتھے دن ہی وہ آگئی۔

”نوبے! ایسی لڑکی دھوڑی ہے کہ سارے شہر میں نہیں ہوگی شریف ماں کی شریف بیٹی خوبصورت، نماز روزے کی پابند، گھڑ، گھر، پلو۔“

فیروز خوش ہو گیا۔

”پراناں ہے کون؟“

”بیاموں؟“

”بتاؤ گی کیوں نہیں؟“

حیدر نے کانٹکی پڑیا کھول کر پاں منہ میں ڈالا اور انگلیوں سے وہ سرخ سرخ کیریں پونچھنے لگی جو اس کے ہونٹوں سے نکل کر شوروی کی طرف نکل کئی تھیں۔ فیروز بے تاب سے اس کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

”ناں بتاؤ نا۔“

”بے خبری نہ ہو۔ بتاتی ہوں۔ وہ اپنا اکبر ٹی ہے نا۔“

”وہ جس کی چھوٹی سی دکان لڑکیوں کے کھل کے پاس ہے۔“

حیدر کو یہ بات بڑی لگی، اس کے ہاتھ پر تیریاں پڑ گئیں۔

”چھوٹی دکان ہے تو کیا ہوا۔ پندرہ برس روپے روز کمالیتا ہے۔ تمہاری اپنی ذات کلا ہے۔“

مکان اپنا ہے — چیز بھی دے گا۔ بروہاں کروں تمہاری طرف سے؟
 فیروز اپنی پیشانی پر داغیں اٹھانے لگی پھرنے لگا۔
 "اے! سوچ کر بتاؤں گا۔"

• کل دوپہر آؤں گی؟

جیسا پہلی گئی تو وہ اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ اسے یاد آگیا کہ وہ تین مرتبہ وہ سافٹ
 رنگ کی ایک لمبے قد عورت کی لڑکی کو اکبر علی کے گھر کے دروازے پر دیکھ چکا تھا وہ ریڑھی تک
 نہیں آئی تھی کہ وہ اس سے سبزی کا نام لیا تھا اور فیروز یہ سبزی تول کر خود اس کے پاس لگا تھا اور
 جتنے پیسے مانگے تھے وہ اس نے فوراً اسے دے دیئے تھے۔ بھانڈ پر کوئی ٹکڑا نہیں کی تھی۔ کئی بار سونے
 سے پہلے فیروز نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا تھا۔ کتنی خرابی ہے آٹھ اٹھارہ بھی میری طرف
 نہیں دیکھا تھا۔ جو بھاؤ جیلا مان گئی پیسے کم کرنے کے لئے کوئی بات نہیں کی۔ یہ لڑکی میری بیوی
 بن جانے لگی تو ٹھیک رہے گا۔

فیروز کو یہ خیال کچھ عجیب لگا اور فوراً اس سے دل پر ایسی جھاگنی۔ اکبر علی کو بد رشتہ منظر
 نہ ہوا تو وہ اضطراب کے عالم میں وہ بستر پر بار بار کودتے ہوئے رہا۔

صبح منڈی سے سولے کر وہ جب اکبر علی کے مکان کے سامنے پہنچا تو اس کا دل دھڑک
 رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح بلند آواز میں نہ کہ سکا۔ کرپے، ٹینڈے، آلو، تازہ سبزیاں، لٹاکوں کو
 ان کی پسند کی ترکاریاں دیتے وقت وہ وہ کو کنگھیوں سے اکبر علی کے دروازے کو بھی دیکھ
 جاتا تھا۔ کئی سنٹ گزر گئے اور دروازہ نہ کھلا۔

ریڑھی کے پاس کوئی گاہک نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بے اختیار یہ آواز ابھر آئی کہ وہ
 آجائے تو کتنا اچھا ہو۔ پہلے اسے کبھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ آج دیکھ لوں گا۔ اسے خود
 اپنی حرکت کا علم نہ ہو سکا اور اس کی ریڑھی اکبر علی کے دروازے سے ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پر
 پہنچ گئی تھی اس نے آواز نہ لگائی۔ کوئی جواب نہ ملا۔

وہ ڈر بھی رہا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ رہا ہو۔

پھر دواؤں کا ڈر سا کھلا۔ اس میں سے ایک ہاتھ نکلا اور زخمی میں ہلکا کر غائب ہو گیا وہ پھر ریڑھی کو دیکھ کر گھٹنے لے گیا۔

اس رات وہ اچھا بار بار اس کے چہرے کے قریب لہرا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سایہ ڈال دیتا تھا۔ ایک سوچ نکلا طہن کر اس کے دل کو چھو جاتا تھا۔

صرف میں دن میں سب کچھ ہو گیا۔ بکری اسی اور اس کی بیوی اپنی صفائی کی بڑھی عمر دیکھ کر ایک خوف کے زیر اثر اس بات کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ کوئی دن کی رات کی طرح مانگے اور وہ فوراً ماں کہہ دیں۔

خاموش خاموش نظروں والی اور شرم کے ماتے اپنے ہی وجود میں گم ہو جانے والی صفائی اس کی بیوی بن گئی۔ اس کے آنے پر فیروز نے غصوں کیا کہ اب اس کے گھر میں وہ بے صفائی اور اسی اور افسروں کی نہیں رہی جس کا احساس کچھ مدت سے فیروز سونے سے پہلے اس کے رگ دہنے میں اتر جاتا تھا صفائی نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا شادی کی پہلی رات کے بعد جو صبح طلوع ہوئی فیروز نے ریڑھی کی ہتھی پر ہاتھ رکھنے سے پہلے اناری کھول کر اس کے پچلے خالے میں پکڑوں کے نیچے جتنے ٹوٹ بکھرے بڑے تھے سب اس کے حوالے کر دیئے تھے۔

تم جانو اور تمہارا کام

فیروز کو یقین تھا کہ یہ دولت دیکھ کر اس کی بیوی بہت خوش ہو جائے گی۔ سکڑا اٹھے گی فرط مسرت میں اس سے پٹ جلے گی۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔

نوٹوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس کے ہونٹوں کو خنکش ہوئی تو اس نے صرف یہ پوچھا۔
کتنا! ظاہر ہے اس کا مطلب تھا یہ سارا کتنا درد پیڑ ہے۔
میں نے کبھی گنا نہیں:

یہ جواب سن کر مصطفیٰ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں نے کبھی تالا نہیں لگایا تھا۔۔۔ بے آؤں!“

مصطفیٰ کے اثبات میں سر ہلادیا۔

فرز نے ریڑھی گھست نکالی اور دو دانے پر دنگ کر لیا۔

”کھو تو نہ جاؤں!“

مصطفیٰ نے نہیں دیکھا سر ہلایا تھا یا ہاں میں۔ وہ سمجھ نہ سکا اور تنہا ہی جاتے وقت یہ سوال

کئی بار اس کے ذہن میں جاگ اٹھا تھا۔

سنائی سے سوانے کر بپ وہ مولادادی کاں کے سامنے آیا تو اسے اٹھنے کا خیال کیا

مولاداد نے لمبے لمبے جھکڑوں میں سے تھک کر بپ کے پاس پہنچ کر بیٹھ کر تھک کر تھک کر تھک کر

اب تو وہ تنہا نہیں تھا۔ گھر میں ایک اور سوتی بھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے مولاداد سے برتن لے کر اسے سان سے چھو دیا۔ چار نرم گرم نان اپنی بھلی کے

نیچے دبانے اور گھر کی طرف جانے لگا۔

دروازہ بند تھا۔

دروازے پر اسٹک پٹنے کی بجائے اس نے آواز نکالی کر پٹے، ٹیڈے، آواز دہرائی

دروازہ بند رہا۔ دروازے کے بند ایک پرٹ دھکا لگا دیا اور اس میں سے ایک لمبے

نکل کر بھاگ گیا۔

فرز کو یہ اور اتنی بات آئی کہ اس نے نوراء دروازے میں سے گر کر دروازے سے لگی مصطفیٰ کو

اپنے سینے سے دھکا دیا اور اس بات کا بھی خیال نہ کیا کہ نان اس کی بھلی سے نکل کر نیچے گر پڑے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور اس نے نان اٹھائے۔“

سانا، اصر ہے۔ اور فرز ریڑھی پر سے برتن اٹھا کر لے آیا۔

”یہ کیوں کیا گھر میں کھانے کی چیزیں باہر سے آئیں گی!“

”ٹھیک ہے اب جیسا کہ رگی۔ اب تو تیار راج ہے۔“ فیروز مسکرا دیا۔

فیروز کی زندگی میں بڑی ہتھاندگی آگئی تھی، صغریٰ کوئی کام اسے بے تاملگی سے کرنے نہیں دیتی تھی، وقت پرناشتہ، وقت پر دہرہ کھانا اور وقت پر ہی رات کا کھانا، شادی کے بعد اسے ایسی راحت ملنے لگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، مگر یوں ہی وہ کمرے ہی میں سوتے تھے، صغریٰ جب تک جاگتی رہتی تھی اسے پکیا بھلتا رہتی تھی۔

گھر میں بجلی نہیں لگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، صغریٰ نے پیسے جمع کر کے وائرنگ کروائی اور کمرے کے اندر شام ہی سے بجلی کا بلب روشن ہونے لگا، بجلی کا پکیا بھی آگیا، مریاں بیت گئیں، سرویوں کا آغاز ہو گیا صغریٰ ہر کام بڑی تیزی سے کیا کرتی تھی۔ مگر اب وہ سست سست نظر آتی تھی، فیروز کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ بیوی سے پرچتا تھا تم بیمار ہو کیا؟

”نہیں وہ منہ پھر کر جواب دیتی

”پھر سست کیوں ہو گئی ہو؟“

”یہ ایک راز ہے۔“

اور یہ راز چند ماہ تک ہی راز رہ سکا۔ گھر میں ایک مہمان آگیا تھا۔ . . . یہ مہمان ایک خوبصورت، پیاداری سی بچی تھی جس کا نام فیروز نے زینت اور صغریٰ نے نازیبا رکھ دیا تھا۔ صغریٰ کا رکھا ہوا نام زیادہ سراہا گیا اس نے فیروز نے بھی یہی نام قبول کر لیا۔ فیروز کی گھر سے باہر کوئی حیثیت نہیں تھی مگر گھر میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ ایک کنبے کا سربراہ تھا اور کاکا گھر کے سارے اخراجات پر اسے کڑا تھا۔

یہ کنبہ بظاہر تین افراد پر مشتمل تھا لیکن اس میں ایک اور فرد بھی تھا۔ تین افراد قرباندار تھے، فیروز صغریٰ اور نازیبا اور یہ فرد بے جان تھا اور ریڑھی کی صورت میں تھا۔ جب تک فیروز کی ماں زندہ تھی وہ اپنے شوہر سے بھی کہتی رہی کہ اس کو بخت کو دوا دے سے باہر رکھا

کہ مگر فیروز کے باپ نے اس کی یہ بات کبھی نہیں مانی تھی اور اب صفائی کو امراد تھا کہ ریڑھی کو باہر نہ لے جائیے اس نے آدھا کو گھیر رکھا ہے اور اپنے باپ کی طرح فیروز بھی اس کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکا تھا۔

فیروز کو اپنی ریڑھی سے بڑی محبت تھی، جمعہ کے روز بھی کر کے وہ اسے دھوتا تھا اور پرانے اخبارات ہٹا کر اپنے پیڑھی بابو احمد دین کے گھر سے نئے اخبارات لا کر اس پر پھیلا دیتا تھا۔

نازی ساڑھے تین سال کی ہو گئی تھی، وہ ریڑھی کے اوپر بیٹھ کر اپنی گلابوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور وہیں بیٹھ کر ناشتہ بھی کرتی تھی۔ دوٹی بھی کھاتی تھی۔ باپ کے رخ کرنے کے باوجود اس سے نیچے نہیں اترتی تھی۔

اور وہ جمعہ کی صبح تھی، جب نازی بڑی جلدی جاگ کر ریڑھی پر جا بیٹھی تھی۔ مگر یوں کے دن تھے، صبح کے وقت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

فیروز ناز پڑھ کر آیا تو اس نے بیٹی کو ریڑھی کے اوپر بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا۔

”سیر کر دے گی؟“

نازی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

فیروز ریڑھی کو باہر لے جانے لگا۔

نازی پہلے تو چند لمحے ڈر کے مارے جھپکی اور پھر ہنسنے لگی۔

فیروز نے اس دن نازی کو کافی دیر تک سیر کرائی اور جب گھر واپس آکر وہ ریڑھی سے نیچے اترتی تو بہت خوش تھی۔

”اگلے جمعہ جس بھی لے جائیں گے، یہ فقرا فیروز نے صفائی سے کہا تھا۔“

ریڑھی پر آصفی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”کیا؟“

”پاگل تو نہیں ہو گئے؟“

اگلے جمعہ کی صبح کو جب سورج کے طلوع ہونے میں کم از کم ایک گھنٹہ باقی تھا، فیروز نے درود تہی صغریٰ کو درٹھی پر بٹھا لیا۔ نازی تو خود بخود سستی ہوئی بیٹھ گئی تھی۔

درٹھی گھر کے دھانڈے سے ادا دور گئی تو صغریٰ کا شرم کے مارے بنا سال ہو گیا۔ وہ بار بار کہتی تھی: ”اے اللہ! اول اللہ میں مر گئی۔“

”بیچنی کیوں ہو۔ ادھر آؤ صحر کوئی ہے؟“ فیروز نے غصے سے کہا۔

صغریٰ شرم سے اپنے آپ میں ڈوبی جا رہی تھی اس کے برعکس نازی بہت خوش تھی قہقہے لگا رہی تھی۔ ”تائیاں بجا رہی تھی۔“

”وہ گھسنے کے بعد درٹھی واپس دروازے پر آ گئی۔ صغریٰ چھلانگ لگا کر اذہر چلی گئی۔“

”بڑے بے شرم ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے؟“

فیروز نے بیوی کے یہ الفاظ سن کر چند لمحوں کے گھوڑ کر دیکھا۔

صغریٰ اہار سے پاس مور نہیں ہے۔ ہانگہ بھی نہیں۔ یہی ہمارے لئے سوڑا دوتا لگتا ہے۔

صغریٰ نے اسے جلت کر دیکھا۔ نہ جانے اس کے شوہر کے جسم پر کچھ اپنا سر دھندلے نے اپنے گہرے رنگ بھلا دیئے تھے کہ وہ چپ چاپ ان بکھرے ہوئے رنگوں کو دیکھتی رہی اور وہیں تک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی چلیں آنسوؤں سے بو جھل ہو گئی ہیں۔

تم دو رہی ہو صغریٰ؟

نہیں۔ نہیں اور صغریٰ اپنے دھپنے کے پڑے آنسو روچنے لگی۔

فیروز ہر جسے کو بچ صیرے چلا ہو کر بیوی کے سر ہانے کھڑے ہو کر دد سے کہتا۔

”موڑ سر کے لئے تیار ہے یہ صاحب؟“

صغریٰ بہت بول کر جاوڑ اپنے چوڑے جسم پر بھیلادرتی اور چہرہ بھی ڈھانپ لیتی۔ نازی جو

ماں کے ساتھ ہی سوتی تھی اچھا ابا کہہ کر چارپائی سے اٹھ رہی تھی۔

”نانہ! تم تو تیار ہو مگر تہاری ماں، دیکھو کیا کر رہی ہے، غیور نے صفائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔“

نانہ! ماں کے چہرے سے چادر ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

”اٹھو نا امی موڑ میں، بیٹھ کر سیر نہیں کرنی!“

”دفعہ دودھ دینا ہے!“

فیروز اس پر ایک لفظ بھی نہ کہتا، خاموش کھڑا رہتا، صفائی چہرے سے چادر ہٹا کر اپنے شوہر کو دیکھتی اور کہنی لمبے دیکھتی رہتی پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آتا کہ آہستہ آہستہ چادر الٹا کرنے لگتی اور شکایت آمیز لہجے میں کہتی۔

”تم تاشا دکھانے لگے لوگوں کو۔“

”تم تاشا کیسا یہ اپنی موڑ ہے؟ فیروز ہنس پڑتا۔“

چارپانچ بار دیر بھی پر بیٹھ کر سر کرنے کے بعد صفائی کی پہلی جھجک دودھ ہو گئی تاہم وہ شوہر کے اصرار پر ہی موڑ بھی پر بیٹھتی تھی۔

گرمیاں ختم ہو گئیں تو سیر کا پروگرام بھی ختم ہو گیا

اس روز فیروز بارہ بجے گھر آیا، اور اس نے اپنے معمول کے مطابق گوجی آؤ، مٹھناؤ، ٹکایا کی آؤ اور لٹکانی تو تازہ دودھ دے پڑا۔ باپ کی آؤ اور سن کر وہ مزور گھر سے باہر آجاتی تھی۔ فیروز کو بیٹی کی شکل دکھائی نہ دی تو اس نے زیر لب کہا ”اللہ فیروز صاحب وہ منڈی کی طرف جانے لگا تھا تو اس کی بیوی نے بتایا تھا، ناند کو سڑی لگ گئی ہے،“ بازاروں میں سے گزرتے وقت اسے بیٹی کا خیال آیا مگر اب اسے نہ دیکھ کر وہ ٹھوکر مڑ ہو گیا۔

کمرے کے اندر جا کر اس نے دیکھا کہ تہی چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے، اور اس کی ماں پاس بیٹھ کر اس کا سر دبا رہی ہے۔

”تے پتے کر رہی ہے؟“ صفری نے شوہر کو آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”ڈاکٹر کو دکھایا؟“

”نہیں — چلے پلائی ہے؟“

فیروز بیٹی پر جھک گیا۔

”نازد بیٹی! کیا ہے؟“

”پتہ نہیں — بابا“

”بارہ بج چکے ہیں۔ ڈاکٹر بارہ ساڑھے بارہ بجے تک رہتے ہیں — لے جاتا ہوں؟“

فیروز نے نازیہ کو گرو میں اٹھایا اور قریبی ڈاکٹر کے کلینک کی طرف جانے لگا۔

ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔

”اسے نمونہ ہو گیا ہے۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے؟“

فیروز کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یاد آ گیا کہ سلاوا د کے بیٹے کو بھی نمونہ ہو گیا تھا

لحد وہ مر گیا تھا۔

اس نے نازیہ کو دونوں بازوؤں میں بچھ کر پیسے سے لگا رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں دوائی اور

دوسرے ہاتھ میں غبارہ جو اس نے کلینک سے باہر نکل کر خریدا تھا۔!

تین دن اور تین راتیں بیاں بھری نازیہ کے قریب بیٹھے رہے۔ سدرہ جو تھے روز وہ

چپ چاپ جلی گئی۔

نازیہ کے پتلے جانے کا صفری کو بڑا افسوس پہنچا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ آہستہ آہستہ

وہ گھر کے کاموں میں مصروف رہنے لگی۔ فیروز چار دن تک منڈی نہ جاسکا۔ پانچویں روز

صفری نے مجبور کر کے اسے بھیج دیا۔

تین ماہ گزر گئے۔

صفری گھر کے کاموں میں برابر مصروف رہتی رہتی تھی۔ وہ کوئی کام بھی بے قاعدگی سے نہیں کرتی

تھی مگر فیروز عسوی کر رہا تھا کہ وہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی چُپ کی رہتی ہے اس سے بہتر
پرچتا، صغریٰ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا تکلیف ہے تمہیں۔ صغریٰ ہر بار یہی کہتی تھی۔ میں بالکل
ٹھیک ہوں۔ تمہیں دہم ہو گیا ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ایک دن وہ بیوی کو مجبور کر کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے سیتھکوپ لگا کر اس کا
معائنہ کیا اور کہا۔ !

”فیروز اے ہسپتال میں لے جاؤ۔“

”کیوں ڈاکٹر صاحب!“

”کہہ جو دیا ہے لے جاؤ۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گئے۔
راتے میں بیاں بیوی خاموش رہے۔ گھر پہنچ کر جب فیروز نے صغریٰ کو مانگے سے اٹارا
اور سہارا دے کر اندر لایا تو وہ بول۔

”میں ہسپتال نہیں جاؤں گی۔“

”ڈاکٹر نے کہا ہے۔ کیوں نہیں جاؤ گی؟“

”کب تک؟ تو کہتا رہے۔ مرنا ہے تو گھر میں مروں گی۔ ہسپتال میں نہیں رہوں گی۔“

اور صغریٰ گھر ہی میں مری۔ جمعرات کی صبح کو اس کا باپ ایک مقامی ڈاکٹر کو گھر لایا جس
نے تاکید کی کہ اسے فوراً ہسپتال میں لے جاؤ۔۔۔ جب اس کا شوہر اور بچے کو لے لوگ اسے
ہسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے تھے تو فیروز نے جھک کر اسے دیکھا اور بیٹھنے پر مدد منتظر
ہونے کہتا ہوا بے بسی میں دائیں طرف کرسی پر گر پڑا اور اس کے ساتھ گھر میں کھرام بپا ہو گیا۔
اب اسے گھر خالی خالی لگتا تھا، اس دروازے پر طرف بے رونق تھی، کہیں کوئی چہرہ نہیں،
کوئی آواز نہیں۔ سات سال کی اندراجی زندگی اسے ایک پتلا ٹھوس ہوتی تھی اس مدت کا
خیال کرتا تھا تو اسے ایسا احساس ہوتا تھا جیسے ایک بہت بھاری مل اس کے سینے پر پڑ رہی
ہو جس سے اس کا سانس رکنے لگا ہے۔

وہ اپنی چار پائی پر پڑے، پرڑے پھٹ کو گھورتا رہتا تھا۔ دیواروں کو گھورتا رہتا تھا۔
 محلے کا کوئی مویا عورت آتی تو چند لمحوں کے مطلق سے نیچے اتر جاتے ورنہ بھوکا پیاسا یہ تھا
 رہتا یا لٹا رہتا، پرڑی، دوست لئے چلنے والے قتل دیتے اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کا دل
 ٹھٹھاتا چلا گیا، بجلی بجی آنکھیں اور بچھ گئیں۔

اتوار کی صبح اس کا سر سخت اٹھا کر کے اسے اپنے گھر لے گیا اس کا ارادہ تھا کہ اسے چند
 روز اپنے یہاں ٹھہرنے لیکن فرزند پورا ایک دن بھی وہاں نہ گزار سکا، شام ہونے میں ابھی
 ایک گھنٹہ باقی تھا کہ وہ بھاگا اپنے گھر کی طرف اور دروازے پر پہنچتے ہی جیسے کسی نے اس کے
 قدم روک لئے دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر اس کی پرڑھی کھڑی تھی جسے صفائی کی موت
 پر آنے والوں نے کمرے میں بیٹھنے کی گنجائش نکالنے کے لئے باہر دھکیل دیا تھا۔

اُسے لگا جیسے پرڑھی خاموش زبان میں اسے بلا رہی ہے۔ اسے اپنے پاس آنے کے
 لئے کہہ رہی ہے۔

وہ آگے بڑھا اور بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ اس کی کتھی پر رکھ دیئے، اس کا سر جھکے
 لگا۔ جتنا چلا گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر کتھی کے نیچے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔
 یکایک وہ ننھے ننھے ہاتھ اس کی گردن میں حائل ہو گئے۔ اچانک اس کے کانوں
 میں آہٹے میرے اللہ کے الفاظ گونجنے لگے۔

اس کے سارے جسم میں ایک نرمی سی، ایک حرارت سی بھیلی چلی گئی، اس نے اپنی
 آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں ہنسی سے لگا دیں جیسے آنکھوں سے اسے جرم دہا اس نے
 اس طرح ہاتھ بڑھا رکھے تھے جیسے ریڑھی کو اپنی گود میں لے چکا ہو۔ جیسے وہ ایک زندہ
 وجود ہو جس کے سانسوں میں اس کی نازیہ، اس کی صفائی کے سانسوں کی گرمی بھر گئی ہو اور یہ
 سانس اس کے چہرے کو اس کی دگ دگ کو چھو رہے ہوں۔

وہ صدمہ بے خبری نہی کھڑا رہا۔ اسی حالت میں کھڑا رہا۔

ملے گزرتے گئے۔ اندھیرا بڑھتا گیا اور پھر محلے میں کوئی شخص بھی یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کب
 ریڑھی سے اٹک ہو کر اندر گیا تھا مگر صبح کے وقت سب حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ وہ پہلے
 کی طرح ریڑھی کی رہتی تھا اس راستے پر چلا جا رہا ہے جو سبزی منڈی کو جاتا ہے۔

عنایت بی بی کا افضال

یہ ایک عجیب تعلق تھا کہ گلزار انصاری اور استاد فیروز دونوں ایک ہی شام کو ایک ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ انصاری صاحب شہر کے مشہور و معروف چنا پر خانہ انصاری پریس کے مالک تھے اور استاد فیروز جو ان کے شاندار بچلے کے قریب ہی رہتا تھا، انصاری پریس میں جلمہ سازی کا کام کرتا تھا۔

جس شام انصاری صاحب کے بچلے میں ان کے پہلو ٹی کے بچے نے پہلا سانس یا بر طرف غرضی کے شادیانے بچنے لگے۔ بچلے کے دو دیوار رنگارنگ روشنیوں کے سیلاب میں ڈوب گئے۔ رات کے دو تین بجے تک مبارک باروینے والوں کا اتنا ہندھارہ، انصاری صاحب نے اپنے ہاں ہراس جنگامہ مسرت کا اچھٹام کیا جس پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ دوسری طرف استاد فیروز کے معمولی سے مکان میں یہ ہوا کہ آج رات تک روشنی رہی اور ہسٹیلوں کی بیویاں استاد کی بیوی عنایت بی بی کے پاس آکر بچے کو دیکھ کر اور منہ میں شکر کے زچہ دیکھ کر ڈھیر ساری دعاؤں سے کر و رخصت ہوتی رہیں۔

ڈیڑھ بجایا ہو گا جب عنایت بی بی نے سر سے نئی اکڑی اور اسے اپنے گچے کے نیچے رکھ دیا اور جب سوئے ہوئے بچے پر نظر ڈالی تو اس کے دل میں ایک ایسا جذبہ خور ہلرا اٹھا جو صرف ایک ماں ہی کے لئے مخصوص ہے یہ جذبہ خور جیسے دل کی گہرائیوں سے نکل کر اس کی دگ دگ میں سرایت کر گیا اور جب اس نے کھڑکی میں سے انصاری صاحب کی جنگ لگائی ہوئی کوٹھی کو دیکھا، تو اس کے باوجود کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، اس کے جذبے میں کوئی کمی نہ آئی۔

عنایت بی بی ہر روز کسی نہ کسی ہمسائی کی زبانی یہ خبر سن لیتی کہ کل انصاری صاحب نے اپنے دوستوں کی بڑی شاندار ضیافت کی ہے اور آج ان کے نکلاں نکلاں رشتے دار بچے کے لئے طرح طرح کے خوبصورت کپڑے لے کر آئے ہیں۔ ایک روز اس نے یہ بھی سنا کہ بچہ ابھی ایک ماہ کا بھی نہیں ہوا کہ بریں کے منجھرنے درمیان کھلنے لگے اس کے لئے بھیج دیئے ہیں۔ وہ ایسی خبریں سن کر صرف سکڑا رہتی، گویا اس کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ دل میں کہتی اور اپنے انضال کو بے اعتبار سینے سے لگا کر بھیج لیتی اور اس کی پیشانی پر کئی برسے ثبت کر دیتی۔ کبھی اسے اپنی اس عروسی کا احساس ضرور ہوتا کہ نہ تو بچے میں اس کا کوئی جندگ ہے نہ سوال میں۔ وہ ایک قیم رڈ کی تھی جب اس کی شادی ہوئی۔ اس کے سر اور اس کا بھی انستال ہو گیا تھا۔

گھر کا کام کاج کرنے کے لئے اس نے اپنی جھوٹی بہن سکینہ کو اپنے ہاں لے لیا۔ سکینہ نے سارا انتظام سنبھال لیا۔ وقت پر بچے کو راز دی وروہ بھی بدلتی۔ اس کے پڑے بچے بھی صاف کتنی رنجی۔ کھانا دانا بھی تیار کر لیتی صبح سے لے کر شام تک گھر میں بیٹھے رہنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا اور حکام سے خارج ہوئی اور ادھر یہ جادہ جا۔ کبھی بغیر مزدور کے بازار میں کوئی چیز خریدنے چلی جاتی اور کبھی یونہی کسی ہمسائے کے گھر میں پہنچ جاتی۔ اور تو اور انصاری صاحب کی کوٹھی میں بھی گھنٹہ بڑھ گھنٹہ گزار آتی۔

اس دور میں کہ عنایت بی بی کے انضال کی طبیعت قدرے ناساز تھی۔ بہن سے کہا:

سکینہ! انضال دو رہا ہے۔ گود میں اٹھا کر ہلا، چپ ہو جائے گا۔

سکینہ نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور باہر دکان میں آگئی۔ کچھ دیر تو بچہ روتا رہا۔ پھر خاموش

ہو گیا۔ عنایت بی بی چار پائی پر بیٹھ کر اس کا نثر تائی رہی۔

سکینہ اند آگئی۔

”آپا! میری بائیس ٹوٹ گئی ہیں۔ اتنا بھاری ہے تیرا لال!“

عنایت بی بی کی پیشانی پر ناگواری کے عالم میں شکنیں پڑ گئیں۔ غوراً بولی،

”دفعہ دور۔۔۔ کالی زبان والی۔“

سکینہ منہ سمود کر بولی :

”اور کیا ہے؟ وہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ بہن کے تھوڑے کچھ کر ڈر گئی اور بات پلٹا کر کہنے لگی۔“

”آپا! ایشاء! الہ بڑا ہی پیارا ہے۔“ اور کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

عنایت بی بی کا منہ ذرا خراب ہو گیا تھا۔ اس نے بہن کی گود سے اپنا بچہ لے لیا اور اسے چارپائی پر لٹا دیا۔

”آپا! اس کے سنے پگھوڑا کیوں نہیں ٹنگوا بیٹیس؟“

عنایت بی بی نے بات سمجھ کر بھی ایسا چہرہ بنایا جیسے وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی ہو۔

”پگھوڑا آپا! پگھوڑا سارے میں بچہ لیتا ہے۔“

اس کی آپا اثبات میں سر ہلانے لگی۔

”آپا! کیا بتاؤں۔ آج میں انصاری صاحب کے گھر گئی تھی۔ وہاں پگھوڑا پڑا تھا۔ اس نے آپا میں

کیا کہوں! ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ جو اٹاں ہے نہ باجی شریا کی ماس۔

وہ کہنے لگی۔ یہ پگھوڑا کسی باہر کے ملک سے آیا ہے۔“

عنایت بی بی نے منہ سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ ٹھٹکی باغھ کر بہن کا چہرہ دیکھتی رہی۔ یہ

بہلا موقع تھا کہ ایک خبر نے اس کے ذہن میں ایک کیکری ڈالی تھی۔

شام کے وقت فیروز گھر آیا۔ اس وقت عنایت بی بی بچے کی آنکھوں میں کاجل ڈال رہی

تھی اور وہ بڑی طرح چلا رہا تھا۔ فیروز نے بچہ گود میں اٹھایا۔ بولا،

”میں میں۔ خبر زادے لپچہ ہو جا۔“

عنایت بی بی نے خود ہر کر کنکھیں سے دیکھا۔

”میں نے کہا جھوٹ ٹوٹ کا شہزادہ ہے!“

”کیوں، جھوٹ ٹوٹ کا کیوں ہو گا؟“ سچ پٹ کا ہے!“

”ہمارے دوہی اجڑوٹ نہ ہو، شہزادے کے لئے ایک پگھوڑا بھی نہیں لائے۔“ غاریت بلی

نے شکایت کیا۔

فرز نے پہلیں کھڑی کو دیکھ کر غرضوں کرتے ہوئے کھڑکی کی طرح سینہ پھلاتے ہوئے اور
افضل کو ماں کی گود میں دیتے ہوئے کہا:

”پگھوڑا کیا میں تو لیت شہزادے کے لئے تخت لے آؤں گا۔ دیکھو تو یہی!“

یہ فقرہ سن کر غاریت بی بی کے دل میں ایک ہم سا خوف پیدا ہو گیا۔ شاید یہ خوف اس
وجہ سے تھا کہ کہیں اس کا شوہر آدھی تھوڑا خرچ کر کے پگھوڑا بھی نہ خرید لائے۔ احتیاط کہنے لگی:

”پگھوڑے بدل تلخ کی پرانی دکانوں پر ملتے ہیں۔“

فرز نے کچھ سوچتے ہوئے ہلکی بجا کر گریٹ کی راکھ جھاڑی مسمول کے مطابق دونوں ہونٹ
بہر کر کے خشک نکلا اور سر ہلاتا کرے سے نکل گیا۔

”سہے وہ نہ پر میں سے واپس آیا تو یہی لے لے پوچھا۔“

”اتنی دیر سے کیوں آئے؟“

”تم نے جو کہہ دیا تھا شہزادے کے لئے پگھوڑا لادو۔“

مکینہ نے جب یہ حفاظت سنے۔ اس وقت وہ نکلے کے نیچے کپڑے دھو رہی تھی۔ صابن اس
کے ہاتھوں کو دھو رہا تھا۔ وہ اسی حالت میں اٹھ کر آ گئی۔ اُسے توقع تھی کہ پگھوڑا کرے کے اندر
ہو گا، مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

”پگھوڑا کہاں ہے، بھائی جان؟“ اس نے بوہرہ نوہر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

فرز نے دوسری مرتبہ خشک نکلا اور وائش ہاتھ میں جو ایک پونگی سی بکڑی ہوئے تھا، اسے
سورے ساتھ لٹکائی۔ تو چار پائی کے اوپر نصف درم کے قریب پلاسٹک کے بنے ہوئے طرح

طرح کے کھلونے بکھرنے لگے۔ سیکین کی آنکھیں ایک طرف سکرپٹ سے چمکنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ غایت بی بی یا سیکین کچھ کہے فیروز بولا،

”پرانا پنگوڑا بھی بیس سے کم میں ملتا۔“

”پھر یہ کیا اٹھا لانے پر؟ غایت بی بی کے لیے میں تلخی تھی۔“

”کھلونے میں کھلونے، سوا پتہ روپے خرچ کئے ہیں؟ فیروز نے یہ الفاظ ایسے بولے جس سے

کے اندر وہی جذبہ قضا کی غازی کردہ تھا۔

غایت بی بی بچے کو چھوڑ کر چارپائی کے نیچے پڑے ہوئے گئے برقی آکٹے کرنے لگی۔ مگر سیکین کو صبر کیاں؟ کہنے لگی:

”بھائی جان! پنگوڑا لے آتے نا۔“

”کس سے آتا؟“

”انصاری صاحب لائے ہیں نا۔“

فیروز نے سگریٹ کا لبکش لیا اور ایک لمحے کے لئے اپنی سالی کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کی دماغی صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کہنے لگا،

”سیکین! جانتی ہو انصاری صاحب کی آمدنی کیا ہے؟ کل ہی ایک بینک سے پچاس ہزار

کا ٹھیکہ ہوا ہے۔ وہ تو دو ہزار کا پنگوڑا بھی خرید سکتا ہے۔ ہم اس کی دس کر سکتے ہیں؟“

غایت بی بی جس نے سارے برقی جمع کرائے تھے اور اب اٹھا کر باہرے جانے والی تھی، اپنے اندر غم و غصے کی ایک شدید لہر سے بے تاب ہو گئی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اس کیفیت کا اظہار کر کے اپنی گھٹن تو دھرنا تھی، بولی:

”سیکین! گھر کا کام نظر نہیں آتا؟“

سیکین کی نظر سائیں لگے، دھنوں پر پڑی تو اسے یاد آگیا کہ گھر کے اوپر بہت سارے کپڑے

اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کمرے میں اب فیروز تنہا افضال کے

پاس رہ گیا۔ اس نے کھولے اسٹے کے اوپر یہ کہتے ہوئے بچے کے چہرے کے پاس لٹکھ مینے:
 ”مے خیرا دے عیش کر!“

سکینہ بی بی کو جو روزے کے پاس کھڑی تھی اس منظر کو دیکھتے ہی نہ جانے کیا ہوا کہ وہ دھپٹے
 کے بنو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

ماہ رمضان کا آغاز ہوا، اس کے ساتھ ہی عید کا تہوار ہنوں میں ٹپل چمانے لگا۔ عزت بی بی
 نے پہلے ہی دن روزے کی انطاری سے پہلے اپنے شوہر سے کہہ دیا:
 ”کھد پتا ہے؟“

فیروز کو خوب معلوم تھا کہ اس کی بیوی کی ان الفاظ سے کیا مراد تھی، مگر وہ انجان بن کر
 پوچھنے لگا:
 ”پتا کس کا؟“

”بڑے بھولے بنتے ہو۔ عید نہیں آ رہی؟“

فیروز نے حسب معمول دانتوں کو زور سے بند کر کے تھوڑا سا اور آہستگی سے کہا:
 ”عید تو ہر سال آتی ہے، اس برس بھی آ جائے گی۔“

اور اس سے پیشتر کہ گفتگو میں کسی قسم کی گمراہی پیدا ہو، وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

”انطاری یونس کے اہل جوگی: یونس اس کے ساتھ چھاپے خانے میں شین میں تھا۔

ایسے سوتھیرہ سکینہ کے لئے چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس وقت بیمار بچیل دہی تھی اور
 اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی نکل آیا تھا۔

”آپا! پتا ہے وہاں کتے جوڑے دپکے ہیں؟“

وہاں سے اس کی مراد انصاری صاحب کا جنگلہ ہوتا تھا۔

عزیزت بی بی کو بہن کی یہ معلقیت پسند نہ تھی، لیکن وہ خاموش رہتی اور اس کی باتیں سنی تھیں۔
 ”آپا! خدا جھوٹ نہ بلائے، دوسو کس بھر گئے ہیں اس کے کپڑوں سے اور ابھی نہ جانے

کہتے اور جڑے گھر میں آئیں گے، آپا!

عنایت بی بی نے میرے پر نظر ڈالی۔ ایک اندرونی اضطراب اور غصہ اس سے اس سے
پر قہقہے کے انہار تھیل گئے۔

”ہمارا انضال، انصاری صاحب کے شاہد جیسا نہیں ہے“

سکینہ نے یہ سوال پوچھ کر اپنی ذہنی کشاکش سے نجات پائی مگر میں کو تو یہ نہیں بھی دینی
کی سبب ہے حیرا، عنایت بی بی نے یہ سوال اس انداز سے پوچھا جیسے اس میں اس کا
اپنا ارادہ شامل نہیں ہے۔

”آپا! ہمارا انضال، شاہد جیسا ہی تو ہے، بلکہ اس کا رنگ اُس سے گہرا ہے“

عنایت بی بی نے اپنا ہاتھ غصے سے ہلا دیا۔ سکینہ آنکھیں ملتی ہوئی برست بدلتی تھی

اس ذات اس نے بچے کو دودھ پلانے ہوئے سوچا، آخر میرے بچے اور ان کے بچے میں

فرق کیا ہے؟ فرق یہی ہے مگر وہ انصاری صاحب کا بچہ ہے جو پیرس کا ملک ہے اور ہمارا بچہ

استاد فیروز کا بیٹا ہے جو ایک جلد ساز ہے، بس اور فرق کیا ہے؟

صبح اٹھ کر جب وہ خوبرو کو کام پر بھیج رہی تھی، اس سے تاکید کہ:

کوئی اور کام کرو۔ ڈیوٹی سٹاپ کے پیچھے لاؤ انضال کے لئے تیرے حریف نے میں۔

فیروز نے اس کے جواب میں حرف ایک لمحے کے لئے بھولی کر دیکھا اور اپنی بڑائی سانس لے

صحن سے باہر نکالے گئے۔

جسک آہ میں تین روز باقی تھے۔ سکینہ میرے میرے ہونے والے انصاری صاحب کے بچے

جو کرائی۔ اور وہ اس گھر آکر ہیں کر جاتی۔

آپا، آج شاہد کا دادا بہت سی چیزیں لے کر آیا تھا۔ ان کی سب ڈاؤن پلگ کے

میں اندر لگی تھی اور شاہد کے لئے اس سے سب صحت کے لئے جو چیزیں تھیں

عنایت بی بی کے دل سے ایک لمحے میں مٹا تھا اور اس کی آنکھوں نے اسے سمجھ

و گھسوں میں بار بار جھٹک اٹھتی اور ایک بڑا بڑا احساس تھا جو انہیں میں مصروفیت کے عالم میں بھی کام کرنے سے روک دیتا اور وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگتے۔

غایت بی بی باورچی خانے سے باہر آئی، تو اس نے دیکھا کہ انفصال کا باب نوکے کے لئے تین روز پیشتر کھڑے طوا تھا۔ وہ ایکس پریس کے اوپر پڑے ہیں، چادر بانی برافصال بھی دکھائی نہیں دیتا اور کیٹن بھی غائب ہے۔

اس نے خیال کیا۔ وہ دیت کہ کچھ پتہ نہ ہوگی، کیونکہ اس قسم کے کام اسی کے ہوتے تھے۔ مگر وہ بچے کہ پتہ کیا رہی ہے۔ اس کے لئے کچھ تو پتہ بھی کے اوپر کھڑے ہوئے ہیں۔

— سیکٹ ہا اس نے آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے "مری مرتبہ پکا لادہ سرے کمرے سے سیکٹر کی آواز آئی، جی آیا؟"

— کیا کوئی ہو؟ میں نے یو جی — "ان انفصال کہاں ہے —"

— کچھ کر دی ہوں آپ انفصال میرے پاس ہے؟

غایت بی بی نے جاؤ اور سرے کے اندر جانے، لیکن جب اس نے دروازے میں قدم رکھا، تو معلوم ہوا دروازہ اندر سے بند ہے۔

یہ کیا مصیبت ہے، غایت بی بی کو بڑا غصہ آیا اس نے جیج کرا اس فیسے کا اظہار کیا،

"دروازہ کیوں بند ہے؟ یہ کیا رہا ہے؟ سیکٹر کی جی، دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟"

سیکٹر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

غایت بی بی نے پہلے دروازے پر دستک دی، پھر اس پر زور زدوں سے ہاتھ مارے۔

پتہ نہ ملے، تو اندر کر کیا رہی ہے؟ کھول دروازہ، کھولتی ہے یا...؟ اس نے ایک خوشنک جھکی

دی، "دروازہ توڑ دوں گی؟"

کھولتی ہوں آپ! پتہ جانا میں ابھی کھول دیتی ہوں۔

”میں پوچھتی ہوں اندر ہو کیا رہا ہے۔“ باغیچہ کی غلیظ مٹی سے غلیظت بی بی کی آواز کانپ کانپ کر رہی تھی۔
 کمرے کے اندر کمر کھڑا ہوا ہوا ہوا۔ اور وہ اندر کھل گیا۔

”آپا! اتھار اٹھو۔ آج ہے نا شہزادہ!“

غلیظت بی بی نے سیکینہ کی گڑبڑ انصاف کو دیکھا جہر پہنا ہی نہیں جاتا تھا۔ نہایت خوبصورت
 قیمتی اور رنگین لباس میں بیویں تھیں۔

غلیظت بی بی سراپا استعجاب بن گئی۔

”آپا! ہے نا سچ بچے کا شہزادہ!“

”پر۔۔۔ غلیظت بی بی اور کچھ نہ کہہ سکی۔

”مگر صبر سے آئے ہیں۔“ انصاف کی صاحب کی جگہ نے ہمارے انصاف کے لئے بھیجے ہیں۔ کتنے

پسے لوگ ہیں آپا!“

اور سیکینہ نے انصاف کا منہ چوم لیا۔

غلیظت بی بی اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی۔

”لو آپا شہزادے کو!“

غلیظت بی بی نے ہاتھ بڑھا دیئے۔ بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ گلتا تھا بچہ ابھی اس کی
 گود سے پھسل پڑے گا اس نے اسے مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ اسے تنگلی ہاتھ کو
 دیکھ رہی تھی اور اس کے ماتھے کی کینٹا لیاں بجا بجا کر ناچ رہی تھیں۔

”آپا! چلو سونا اپنے شہزادے کو!“

غلیظت بی بی نے بچے کو زرا اوپر اٹھایا اس کے ہونٹ اس کی پیشانی کو چھونے لگے، مگر
 ایک لمٹ اس نے ہونٹ بچے کے ماتھے سے ہٹائے۔ اسے یکا یک ایک عجیب سا احساس
 ہوئے لگا۔

”یہ انصاف۔۔۔ اس کا انصاف نہیں۔ اس کا اپنا انصاف نہیں۔ یہ بہت قیمتی کچھ ہے ہونے

ہرے کون ہے؟ کیا میرا اپنا ہی انضال ہے؟ نہیں نہیں، یہ تو...

اس کے بازوؤں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

وہ بچے کو گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ کئی لمحے دیکھتی رہی پھر سیکنڈ سے بلند اور حکم آمیز لہجے

میں بولی،

”سیکنڈ! اٹا کر دو یہ کپڑے، پہنلو وہ کپڑے“ اس نے بیڑھی پر پڑے ہوئے کپڑوں کی

طرف اشارہ کیا۔

سیکنڈ ایک دم سنانے میں آگئی۔ اس نے بہن کی طرف دیکھا جو پوری سنجیدگی سے بچے کو

اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔

درویش

وہ جب اس جہتی میں داخل ہوا تو بھوک پیاس سے ٹھہال اور تھکاوٹ سے چوڑ چوڑ ہو چکا تھا۔ ایک قدم اٹھانا بھی اس کے لئے درد بھر تھا۔ آج ہی وہ چار سال کی قید کاٹ کر جیل سے رہا ہوا تھا۔ گھر بار کوئی تھا نہیں اپنے تینوں دوستوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ اس کو یہ تینوں دوست کہیں بھی نہیں ملے تھے۔ شاید قید کاٹ رہے تھے یا یہ محسوس کر کے کہ بھر میں کافی بدنام ہو چکے ہیں قیمت آزمانی کے لئے کہیں اور چلے گئے تھے۔

نام ہرچی تھی۔ یہ یعنی کایردنی اور قدرے غیر آباد حصہ تھا کیونکہ یہاں لوگ بہت کم آتے جاتے تھے۔ گھروں سے روٹیناں پھوٹ رہی تھیں، دھواں نکل رہا تھا کسی گھر تک پہنچنا اس کے لئے ایک دشوار امر تھا وہ تو چاہتا تھا کہ وہیں زمین پر لیٹ جائے۔ بھوک پیاس کی شدت کا بھی خیال اس کے ذہن میں دب چکا تھا۔ اس نے ایک درخت کے تنے پر اپنا جایاں اٹھ رکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے بیٹھنے کا ارادہ کری رہا تھا کہ چند گھنٹے کے غائبے پر اسے ایک عمارت کی دھندلی سی دیوار نظر آئی۔ وہ یہ سوچ کر اس کی طرف بڑھا کہ اس کے دروازے پر دھک دے گا۔ خود کو ایک تھکا ہوا مسافر بتائے گا۔ اور یہیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور روٹ گزارنے کے لئے تھوڑی سی جگہ کے لئے درخواست کرے گا۔ اس نے بار بار مٹا تھا کہ قبضوں اور پیتھوں کے لوگ مسافروں کے ساتھ بڑا اچھا سوک کرتے ہیں اس لئے اس سے بھی اچھا سلوک کیا جائے گا

بڑی خشکی سے اس نے چند قدم اٹھائے۔ وہاں پہنچا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دیوار تو

کھڑی ہے مگر اس میں دردازہ کوئی نہیں۔ دو دیواروں کے درمیان ایک عام دردازے جتنا خلا ضرور تھا۔ جو شاید دردازے کا کام دیتا ہو گا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ آگے بڑھ جاتا کسی اور عمارت کے دردازے پر جا کر دنگ دیتا مگر اس وقت تو وہ اس قدر خستہ حال ہو چکا تھا کہ آگے چلنا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔

وہ اندر چلا گیا۔ زمیں پر دو ختوں کے ڈھیروں پر پڑے تھے کئی درخت اس عمارت کے ارد گرد کھڑے تھے۔ تیرہواں سے انہی کے پتے وہاں جا کر سے تھے۔ یہ کافی کٹا ہوا جگہ تھی۔ اس سے ملحق جو جگہ تھی وہ ذرا اونچی تھی اور اس کے اوپر چھت بڑھ چکی تھی۔

”یہ غیر مکمل عمارت کیلئے ہے۔ اس حالت میں کمروں چھوڑ دیا گیا ہے؟“ اس کے سامنے میں ایک سوال ابھرا لیکن اس پر غور کرنے کی اس میں سکت نہیں تھی وہ چھت کے نیچے بیٹ گیا۔ ابھی چھت پر دی نہیں پڑی تھی۔ آخری کڑی اور دیوار کے درمیان کم از کم ایک گز کا نا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس خالی جگہ میں سے نویر یا دوسروں کے چاند کی درختی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ موسم گرمیوں کے اختتام اور سردیوں کے آغاز کا تھا۔ آدمی بیفر چادر یا کپڑے کے بھی سو سکتا تھا۔ بیٹے کو تو وہ لیٹ گیا تھا مگر نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی اسے یقین تھا کہ جیسے ہی وہ لیٹے گا گہری نیند سو جائے گا لیکن اتنی تھکاوٹ کے باوجود وہ کد پر کدوٹ بدل رہا تھا اور آنکھیں بدستور کھلی تھیں۔

ایسی حالت میں انسان لامحالہ کچھ سوچنے لگتا ہے۔ خاص کر اپنی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات اور وہ بھی ماضی کے دھند نکھوں میں ڈوبے اپنے اس زمانے میں چلا گیا جب وہ امرتسر کے ایک محلہ بازار بکر داس میں پاؤں پاؤں چلا تھا۔ باپ ایک سولہ دوکاندار تھا جو کچھ کاتا تھا۔ اس سے گھر کی بنیادی چیزیں ہی پوری ہوتی تھی۔ نصیراں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس سلسلے ناز و نعم میں پرورش پا رہا تھا۔ ابھی اس کی عمر پانچ سال کی ہوئی تھی کہ پاکستان قائم ہو گیا۔ اس کے ماں باپ نہ جانے کتنے خطروں سے گزر کر اسے لاہور کے بھائی دردازے کے اندر لے آئے

جہاں ان کا ایک دستہ وار پچھلے چالیس برس سے مقیم تھا۔ اس دستہ وار نے انہیں رہنے کے لئے اپنے وسیع مکان کے نچلے دو کمرے دے دیئے۔ انہیں مہار اتو مل گیا تھا لیکن گھر کا خرچ چلانے کے لئے تو انہیں خود ہی انتظام کرنا تھا۔ نصیر کا باپ صرف دوکاندار ہی جانتا تھا۔ لیکن یہاں اسے کوئی دوکان نہ مل سکی ناچار ایک برس میں ملازم ہو گیا۔

افرنٹری کا زمانہ تھا۔ کسی کو کسی کی پردہ انہیں تھی نصیر کا باپ صبح جاتا تھا اور سونچ ٹیٹ واپس آتا تھا۔ آتے ہی کچھ کھانا کرسو جاتا تھا اور صبح تک اسے کچھ ہوش نہیں رہتا تھا نصیر جب امرتسر میں تھا تو کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ لاہور آیا تو اگرچہ اس کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ کسی مدرسے میں داخل ہو جائے لیکن اسکے ماں باپ کی مدد ہی سرگرمیاں صرف دونی پڑا میا کرنے تک محدود ہو چکی تھیں اس لئے نصیر کھلے میں سالاروں کیسینے کی تیزی تھی باپ آتا تھا تو اسے مکان سے پکڑ کر گھر کے اندر لے آتا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ اس کے کپڑے گرد آلود اور لم تھیں اور چہرے پر مٹی کی تھیں جسم بھی بوٹی تھیں۔

تھیل کا چسکا نصیر کو اس قدر لگ چکا تھا کہ وہ گھر میں لگنا ہی نہیں تھا۔ ادھر باپ پڑیس گیا اور ادھر وہ بھاگا بھاگا باہر پہنچ گیا۔

ایک سال یونہی بیت گیا۔ چھ سال میں اس کے باپ نے لہر بیٹ کر اسے ایک قریبی مدرسے میں داخل کرا دیا کچھ روز تو وہ بستہ تھا کہ نامادہ کلاس میں جاتا رہا۔ پھر وہی کچھ ہونے لگا جو پہلے ہوتا رہا تھا۔ اسی جھٹی کے وقت وہ اپنے خاص دوستوں کے ساتھ بھاگ جاتا تھا اور شام کے قریب واپس آتا تھا۔

اس خرچ ایک اور سال ضائع ہو گیا۔ اس کی ماں نے اسے مسجد کے مولوی کے بیوہ کو دیا۔ وہاں بھی اس کا یہی دھڑو رہا۔ ناچار باپ نے اسے سونڑوں کی ایک دکانپ میں کام کیے کے لئے دکانپ کے بڑے سڑی کے حوالے کر کے بھی لیا کہ پلو پار پیسے کی آمدنی ہو جائے پر گھر کا خرچ چلانے میں تو اسے سہولت نکل آئے گی۔

دو سال تک اس کی توقع پوری ہوئی، مگر سستی سے نہں۔۔۔ بے لاکھوں کے
 دھنوں میں دھندل پھر ایک ان صبح کی صبح سستی نے اس کے گھر آ کر کھانا کھا کر
 باپ ابھرایا۔

”کیوں خبر تو ہے سستی جی؟“

”ہاں خیر ہے صدو دینا! میں یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ نصیر کو سمجھا لو۔“

”کیوں کیا ہوا ہے؟“

”ہونا کیا تھا جو راجکوں کی ایک بانی بنی ہوئی ہے مرزا اس بانی کا ایڈر ہے
 چند روز ہوئے مرزا تیار سے بننے سے نئے لے آیا تھا۔ مجھے اسی وقت تک پڑ گیا
 تھا پڑھوں سے وہ کتاب سے میری بات نہ سونے شروع ہو گئے ہیں۔ کچھ کیا۔۔۔
 یہ بات صدو دین کی بھٹی میں۔۔۔ ان دنوں نظروں سے سستی کو دیکھ کر کہہ سکتی ہیں
 پیشانی پر نئی پڑھنے اور وہ غصے سے لولا۔“

”صدو دینا! تم کس دنیا میں رہتے ہو۔۔۔ ان دنوں گاہ چور ہے وہ بے وقوف
 لوگوں کو اتنا بنا کر ان کے ذریعے دنیا میں۔۔۔ پڑھنے حاصل کرتا ہے اور بازار میں جا کر
 بیچ دیتا ہے۔ یہی اس کا سہارا۔“

”تو میرے نصیر نے کیا کیا ہے؟“

”سستی کا چہرہ نصیر سے سرکش ہو گیا تو جی رہ گئے۔“

”تمہارے نصیر نے یہ کیا کیا کرنا۔۔۔ کتاب سے پڑھ کر اسے دیتا رہتا ہے
 اب تو صاف ملن سن لیا تا۔ صدو دینا۔“

”پھر سستی کا اب وہ عجیب عالم ہو گیا۔ تمہاری شریف آدمی ہو اس لئے تمہارے بے کے
 کے کہ تو نصیر سے تمہیں واقف کر دیا ہے اب کچھ اور وہ نتیجہ بہت خراب ہو گا۔“

”یہ کہہ کر سستی چلا گیا۔ صدو دین نے یہ سارا قصہ اپنی بیوی کو بھی بتا دیا وہ مٹائی میں

اسی پھر رہی تھی۔ یہ بات سن کر اس کا ہاتھ وہیں اُٹک گیا اور چہرہ پٹلا پڑ گیا کافی دیر کے بعد اس کے منہ سے نف یہ الفاظ نکلے۔ "نیر دین کے آ! میرا نصیر ایسا نہیں ہو سکتا، صد دین سے یہ کاکلی جواب نہ دیا جب چاہے نہ بٹنے کے پاس میرا بھی کے اوپر چٹھا گھر آتے ہوئے سیاہ بالوں کو گھورتا رہا۔

نیر دین آیا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی ٹوکریں تھیں جو اس نے اس کے اٹکے رکھ رکھی اور اس موقع کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے دکھا کر وہ اچھی اچھ کر اسے چٹنے سے اٹکے آئی۔ اس کا ہاتھ جو کم کر ڈھیر ساری دھاریں دے گی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہے یا کوئی حرکت کرے۔ اس کا آپ کر رہا

نصیر۔ یہ ہے کہاں سے لائے تھے؟

ستری نے دیٹے تھے۔

آج تو یہ وہ تاریخ ہے۔ بیٹے کی تنخواہ بندہ کر کے لے گئی؟

جس چاہے۔ یہ تنخواہ کے لیے نہیں میں ستری سے یہ کام پر پیش ہو کر دیتے ہیں نصیر نے صد دین کا چہرہ سرخ کر دیا۔ وہ بیڑی سے اٹھ بیٹھا۔ چور سے چور سے بیٹے کے گال پر تھپڑ مار کر بولا۔

تو اس زمانے میں تو ہے۔ درکناس کے بڑے بڑے جواہر ہمعائی گرد و گشت مرزا کو دیتا ہے۔ نصیر نصیر کیا کر دیا اسے جا بھگ دیا۔ صد دین نے نہ لایا تھا لیکن اس کی بیوی نے چٹے والے ہاتھ پر کیا صد دین دونوں کو گالوں پر گالیاں دیتا رہا۔ آخر بیٹا اس نے بیوی کے ہاتھ میں دے دیا۔ دیکھ۔ زہرا! اسے کہہ دو آئندہ اس سے ایسی حرکت کی اور مرزا سے نہ کہہ کہ تو میں لے گھر سے نکال دوں گا۔ اناں دعائے کہے دیتا ہوں۔

وہ مہاجر چھوڑ گیا۔ اس کے پاس کے بعد رہا۔ یہ وہ سالوں میں وہ وہاں ہی رہا۔ اس نے صد دین کے اندر غصے کی آگ بھڑکادی تھی اس نے یہی کا چہرہ دکھایا۔ اس کے بالوں

میں بار بار شفقت سے اپنی انگلیاں پھیریں اور بڑے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا: نصیر! یہ جسے اصل: 'کنڈا' کہتے ہیں، اسے کپڑوں کی محبت میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ تو ہی خود بڑا ہو جائے گا۔ تجھے کیا پڑی ہے کہ اس بے صافش سرخاڑے باری کرے۔ نہ پتھر! نہ ہم غریب لوگ! میں تیرے ساتھ کچھ ایسا دے گا ہو گیا تو ہم کسی کو مدد کھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اللہ عزت کی رال رانی دیتا ہے۔ صبر شوکر کر کے کھا پیتے ہیں:

ماں کے یہ الفاظ سن کر نصیر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر یہ ایک واقعی کیفیت تھی ایک ہفتے بعد ہی نصیر کو ماریٹ کو درکٹاپ سے نکال دیا گیا۔ باپ اسے اپنے ساتھ پریس لے جانے لگا۔ پریس کے کام میں نصیر کامل نہیں لگتا تھا۔ باپ کے ساتھ تو چلا جاتا مگر جب کاریگروں کو کھانا کھانے کی چٹنی ملتی وہ چپ چاپ پریس کے چورہ دانے سے ٹکل کر سیدھا سرخاڑے کے ہاں چلا جاتا۔

سرخاڑے جیسے وہ استاد کہہ کر پکارتا تھا اسے اپنے کرتب کھانے شروع کر دیتے تھے۔ اور جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی وہ اپنے من میں بھی ہوشیار ہوتا چلا جاتا تھا۔ مگر اس نے ابھی تک چھوٹی چھوٹی داد و بات کی تھیں۔ کوئی بڑا سر کر نہیں مارا تھا۔

ماں اسے دو دو کو کھاتی دہتی تھی۔ باپ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ بیٹے کی طرف سے بالکل ایس ہو گیا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ اس کا ریشاب گھر میں آتا ہے اور کب باہر نکل جاتا ہے۔ اور یوں وقت گزر رہا تھا۔

سولہ سال کی عمر میں نصیر نے بڑی کارروائی کی اور رینگے ہاتھوں بکلا لیا، جیب تراسی کے جرم میں اسے نو ملٹی سال کی سزا ہو گئی۔

ماں نے یہ ہزرتی قواس پر بھی گر پڑی۔ باپ کو سلوم ہوا تو وہ بوی سے مخاطب ہو کر بولا: 'میں پہلے ہی جانتا تھا، یہ ہو گا۔ کچھ لے کر آؤ یا مچکے۔'

'کیسے کچھ لوں ماں نے پہلے پر دو ہزرتا دتے ہوئے کہا۔ خدا کے واسطے کچھ کرو:

”میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے بھی اندر کرانا چاہیے ہو؟“

وہ جیل میں آخری سال کی سزا کاٹ رہا تھا کہ ایک عزیز نے آکر خبر سچائی کہ تیری ماں مر گئی ہے۔

یہ خبر سن کر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور وہ ساری رات سو نہ سکا۔ سزا کاٹ کر وہ گھر آیا تو باپ نے کہا: ”کیا کرنے آئے ہو؟“ مجھے سینے سے لگانے والی ماں مر گئی ہے۔ دفعہ دہرہ چار سویری نظروں سے۔ میرا تیرے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ اٹلے پاؤں گھر سے نکل آیا۔

اس گھر کے سوا اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور یہاں سے اسے نکال دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا سٹی گیٹ میں سرفراز کے ہاں جا پہنچا۔ سرفراز نے اس کی پوری داستان سنی تو کہنے لگا: ”یار اس میں گھبرانے کی بہلا کیا بات ہے۔ میرے پاس ایک کمرہ تو ہے۔ نادو نوں مزے سے رہیں گے۔ اچھی رقم کہیں سے ملے تو اتنا مکان خرید لیں گے۔ دونوں کوشش کرتے ہیں۔ اندر راز ملے۔“

سرفراز نے بزرگوں کی طرح اس کی پیٹھ پر چھکی دی۔ بازار سے نان کیاب لے آیا اور دونوں کھا کر سو گئے۔

اس کی ہیم جاری رہی مگر کبھی سو مدیر ملے تو اتنا آجائے۔ کبھی تین چار سو۔ یہی حالت سرفراز کی بھی تھی۔ اس طرح سات برس گزر گئے۔

ایک بار اس نے بس میں بڑھیا لباس میں ملبوس ایک بڑی بڑی مرنچھوں والے فربانگ شخص کو دیکھا۔ سمجھ لیا اس کی جیب میں ہست کچھ ہو گا۔ تجربے نے اسے سکھایا تھا کہ ایسے لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ سارا درمیر ایک ہی جیب میں نہیں رکھتے۔ کئی جیبوں میں رکھتے ہیں۔ بس میں اتنا جہوم تھا کہ تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ یہ اس کے لئے سہری موقع تھا۔ جب وہ بڑی مرنچھوں والا بس سے نیچے اترنے لگا تو اس نے اس کی ایک جیب کی صفائی کر ڈالی۔ اور

انڈاز میں کہہ رہی تھیں کہ تجھے اس سے پہلے یہاں کہیں نہیں دیکھا گیا کہاں سے آ گیا ہے۔
اس نے نمود وانی کی نظروں کا مضمون سمجھ لیا مگر سراسر طرح جھکا یا جیسے وہ اس سوال کو
مکمل اہمیت نہیں دیتا۔

بیٹ بھرنے کے بعد وہ واپس اسی جگہ آ گیا۔ اب وہ یٹا تو نیند کا غبار اس کی آنکھوں
پر چھا گیا۔ ابھی وہ گہری نیند سو رہی رہا تھا کہ اس نے اپنے چہرے کے قریب آگ جلتی
ہوئی محسوس کی، گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

سورج اوپر چمک رہا تھا اور اس کی شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔
اس نے دیکھا کہ کئی لڑکے اس کے پاس کھڑے ہیں اور ایک لڑکا دوسرے سے کہہ رہا
ہے۔ یہ مسیت کا موٹی ہے۔

مسیت کا لفظ سننے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”موٹی جی! تم یہاں رہو گے؟ ایک لڑکے نے پوچھا۔

نصیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم لڑکوں کو پڑھاؤ گے؟ دوسرے نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

لڑکوں نے اسے گھیر دیکھا تھا اور طرح طرح کے سوالوں سے اسے پریشان کر رہے
تھے۔ یکایک وہ سب کے سب خاموش ہو گئے۔ ایک بوڑھا شخص جس نے نیلے رنگ کے
ڈھسے کی ٹیکر مار رکھی تھی۔ لٹکار کر لڑکوں سے کہنے لگا۔

”اوشیطانو! کیا تم نے لٹکار رکھا ہے مسجد کے اندر؟

ایک لڑکے نے اس کی طرف رخ کیا حاجی جی اب پتہ نہیں کہ وہ مسیت میں

آ بیٹھا ہے؟

وہ شخص جسے لڑکے نے حاجی جی کہا تھا نصیر پر توجہی نگاہ میں ڈالنا ہوا آگے بڑھا اور اس

کے قریب آکر رک گیا۔

”کون ہو تم جہان؟ کہاں سے آئے ہو۔ میری مسجد میں کیوں آ بیٹھے ہو؟ حاجی جی نے ایک ہی سانس میں تین سوال جڑ دیئے۔

جب وہ بچہ تھا تو اس نے اپنے باپ سے ایک کہانی سنی تھی جس میں ایک جن انسان کا روپ دھار کر ایک مسجد میں تدویش بن کر بیٹھ جاتا ہے اور کئی سال موری سے سبق پڑھتا ہے اس نے بے ساختہ کہہ دیا۔

”میں تدویش ہوں؟“

”تدویش ہو تو تدویشوں والے کام کرو۔ اس طرح نکلے کیوں بیٹھے ہو؟ حاجی صاحب نے کھیل کا سرا لہرایا اور دودانے سے نکل گئے، لڑکے بھی چلے گئے۔ فیصرت نے اپنے دل سے سوال کیا میں اب کام کیا کروں؟ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ دیواروں پر مرد کی تصویریں تھیں۔ زمین پر کوزا کرکٹ کے انبار لگے تھے۔ وہ مسجد سے باہر آیا۔ ایک دکان سے جھارو خریدا اور مسجد کے اندر آکر جھارو دینے لگا۔ اس نے دیکھا کہ دودانے کے قریب لڑکے اسے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ دوپہر کے وقت اسے بھوک لگی تو خورد پر آگیا۔ بیٹ بھڑو روٹی کھانی اور پھر وہیں اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گیا۔ آنگھ اس وقت کھلی جب شام کی سیاہی پھیل چکی تھی۔

”مسجد میں تو روشنی بھی ہوئی چاہیئے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا جس دکان سے جھارو خریدا تھا وہاں سے تین موم بنیاں اور ایک ماچس خرید کر لے آیا۔ مسجد کے صحن میں ایک جگہ ٹہل اینٹوں کا ڈھیر بٹا تھا۔ فیصرت دیوار کے ساتھ ایک گزنیک دو درائیں کھڑی کر دیں اور ان کے اوپر ایک ایک موم جی جلا دی۔

موم جی کی یہ روشنی اس فضا میں عجیب سا منظر پیدا کر رہی تھی۔ یہ منظر دھندلا دھندلا سا اجنبی اجنبی سا اور جھپاک جھپاک سا۔ وہ ایک موم جی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور موم جی کی ٹوک

دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد یہ روشنی اسے بڑی پیاری لگی۔ جیل کی دائیں اندھیری ہوتی تھیں۔ چار سال تک مسلسل اندھروں میں سانس لینے کے بعد اسے یہ پہلی روشنی نظر آئی تھی۔ جو اس کے سینے سے پھیلی ہوئی تھی۔ اور جسے اس نے خود روشن کیا تھا۔

وہ دواور اینٹیں لے آیا اور ان کے اوپر اپنا سر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک بند رکھیں۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ فضا میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اس نے آنکھیں کھولی کر دیکھا۔ دو فرس موم بتیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے عیسوی بھی جلا دی۔

اُسی رات نہیں گزری ہوگی کہ تینوں موم بتیاں جل چکی تھیں۔

یہ ٹھیک نہیں۔ میں لمپ لاؤں گا۔

اور صبح سویرے جیسے ہی درکھان کھلی وہ لمپ لے آیا اور موم بتی کی جگہ اینٹوں کے اوپر رکھ دیا۔ ساری مسجد میں بھاڑ دی اور ادھر ادھر جو اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے انہیں باہر پھینک دیا۔ اس کام میں وہ اس طرح مصروف رہا کہ دوپہر کے وقت تنور پر ہاکر دہنی بھی نہ کھا سکا۔ اور جب دو بجے تنور پر بیچا تو دریاں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ واپس آکر پھر کام میں لگ گیا۔

پانچ روز بیت گئے تھے۔ چھ روز حاجی صاحب اپنے نیلے کپڑے کی نیکل مارے آ گئے۔

”لگتا ہے تھکرا گھرا کوئی نہیں؟“

”کوئی نہیں۔“

”مسجد کی خدمت کد گئے؟“

”جی۔“

حاجی صاحب ایک منٹ خاموش رہے۔ پھر لمبے۔

”اس سے پہلے کیا کرتے رہے ہو؟“

اس سوال کا جواب دینا اس کے لئے مشکل تھا۔ تاہم جواب دینا بھی ضروری تھا۔
”کچھ نہیں؟“

”میں سدی عرقم نے کچھ نہیں کیا۔“

وہ خاموش رہا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“

”نصیر۔“

”اپنے گھر کیوں نہیں جاتے؟“

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ ماں مر گئی تھی۔ باپ نے گھر سے نکال دیا ہے۔“

”کیوں نکال دیا ہے؟“

حاجی صاحب اب کے دوست تک بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے رہے۔

”دیکھو نصیر! میرا نام حاجی الدین ہے۔ وہ جو کبار کی دکان ہے نا اس کے سامنے

میری حویلی ہے۔ پیلے رنگ کی میں نے تمہارا مسجد کو بنوایا ہے۔ یہ ختم ہو گئے تو یہ

نامکمل رہ گئی۔ میرا ایک چھوٹا مکان بھی ہے۔ اسے بچے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بیک گیا

تو اسے کھل کر دوں گا۔ تم یہاں پوری طرح درویش بن جاؤ تو در پر میٹھ کر روٹی مت کھاؤ۔

وہ پہرا اور شام کو روٹی میرے یہاں سے لے آیا کرو۔ میں یہاں ہے نا میری حویلی وہ سامنے ہے

کبار کی دکان کے سامنے پیلے رنگ کی۔“

”ابھاجی۔“

اسے حاجی صاحب کے گھر سے روٹی ملنے لگی۔ تاہم اس نے خود بھی مٹی کا ایک پیلا،

ایک سٹیل اور پانی پینے کے لئے ٹینے کا ایک معمولی گلاس خرید لیا۔ کبھی دیر ہو جاتی تھی تو

وہ حاجی صاحب کے گھر نہیں جاتا تھا۔ بخور سے دو روٹیاں پیلے میں دال لے لیتا تھا اور

آتے ہوئے یہ پینل کٹی کے ٹی سے اپنا گلاس بھی پانی سے بھر لیتا تھا۔ اپنی جگہ پر روٹی کھانے

لگتا تھا تو اسے عجیب قسم کی راحت ملتی تھی۔ ایک دو بہرہ رو دہائی سے پیٹ بھر رہا تھا تو ایک چڑیا اوپر درخت کی کسی شاخ سے اڑا کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”بھوک لگی ہے بچادی کو اور اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا الگ کیا اور اسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے چڑیا کے آگے پھینک دیا۔ اس نے میں اور چڑیاں بھی آگئیں۔ وہ حاجی صاحب کے گھر سے اپنی روٹی لاتا تھا تو غریبوں سے ایک نانا تو روٹی بھی خرید لیتا تھا۔ یہ روٹی چڑیوں کے لئے ہوتی تھی۔ چڑیوں کو پیٹ بھرے دیکھ کر اسے ناقابل فہم خوشی ہوتی تھی۔ چڑیاں اس کے آتے ہی نیچے آ جاتی تھیں۔

وہ ایک اور پیارے آیلٹاس میں وہ چڑیوں کے لئے پانی لے آتا تھا۔ اس کام میں اس کا دل بہل گیا تھا اور وقت کا کچھ حصہ بڑی خوشگوار کیفیت میں بسر ہو جاتا تھا۔ حاجی صاحب دوسرے تیسرے دن آ کر یہ خبر سنا دیتے تھے۔

بات چل رہی ہے۔ اچھے پیسے مل جائیں تو چھوٹا مکان بیچ دوں۔ اتنے پیسے تو ہوں نا دیوڑھا کر مسجد مکمل ہو جائے۔“

”جانی صاحب! اس نیک کام میں دوسرے لوگ شامل نہیں ہو سکتے نا ایک روز نصیر نے پوچھ لیا۔

”واہ دردیش! کیسی بات کہتا ہے۔ سادی بستی میں مشہور ہے کہ یہ مسجد جانی اور پرن کی ہے۔ میں نہیں خیر کروں گا تو نور کون کرے گا؟ دردیش! اللہ سے دعا کرو کہ مکان جلدی یک جائے۔ اللہ کے گھر کو اس مالک میں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔“ حاجی صاحب بولے۔

”نصیر پھر کئی بھتے خاموشی سے بیٹھ گئے۔ نصیر مسجد کے کاموں میں مگرمی رہے۔ رہا تھا اور حاجی صاحب اس کے سامنے اور اس کی عدم موجودگی میں لوگوں سے بکھتے دہکتے تھے۔“

”دیکھو ایسا ہوتا ہے دردیش۔“

عاجی صاحب اس سے اس حد تک متاثر ہو چکے تھے کہ اس سے کئی بار کہہ چکے تھے: "مردِ نیک! تبارے لئے یہاں ایک بہت شاندار حجرہ بنے گا جس میں تم بڑے آرام سے رہنا اور مسجد کی خدمت کرنا۔ تبار کی شادی بھی کر دی جائے گی۔" اور وہ اس کی پیٹھ چھتیا پاتے ہوئے یہ خوشخبری سناتے رہے مگر مزے سے رہو گئے۔ کسی شے کی کمی نہیں ہوگی آج سے تبار سے خرچے پانی کا بھی انتظام کر دیا ہے جو بھی اللہ کے فکر کی خدمت کرتا ہے اسے اللہ بہت کچھ دیتا ہے کچھ لیا تا؟ انہی دونوں عاجی صاحب کا سہل معقول رقم پر بک گیا اور مسجد کی تعمیر ہونے لگی۔

عاجی صاحب نے نصیر کے بہرہ سارے اختیارات کر دینے تھے وہی بازار سے عزت کی چیزیں خرید کر لاتا تھا۔ کاریگوں اور مزدوروں کا حساب کتاب رکھتا تھا اور ان کاموں کے لئے ہر وقت اس کے پاس خاسا روپیہ جمع رہتا تھا۔

چاروں مصلحتوں کا بادشاہ بنی تو تعمیر کا کام رک گیا۔ پانچویں روز بازار میں قنوں کئی بیمار اور مزدور آگئے۔ سینٹ دیت اور گلڑی۔ یہ چیزیں قریب قریب ختم ہو گئی تھیں اور پانچ جب سب لوگ چھٹی کر کے گھروں کو جانے لگے نصیر نے ملک بھگوان جن استاد میں کئی دفع ہو گئی ہے وہ بازار سے خرید لائے اور وہ مانگ کر دنا۔ بستی سے نکل پڑا شعر آرمینٹ کی جہازیں اس نے ریڑھے پہلو کر دھر بیچ دیں اور خود گلڑی خریدنے کے لئے ٹیبرا ایکٹ کی طرف جانے لگا۔

وادی دہڑ پر اس کا مانگ جاری تھا کہ اس کی نظر دائیں طرف، باغ کے کنارے جنگل کے سامنے ایک فقیر پر پڑی جو فٹ پاتھر پر نیم دنا تھا اور اس کا اٹھ گدائی کے لئے پھیلا ہوا تھا۔ ایک بھلی سی اس کے ذہن میں گونڈ گئی: کیا یہ —؟

اس نے مانگ کر کہا: "بیچے اترا اور جنگل کی طرف چل پڑا۔"

اس کی نظروں کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اس کے سامنے سرخاڑی تھا۔

"استاد اتم۔" نصیر نے اس پر جھک کر کہا۔

”نہیں ہو؟“ سرزاز نے پھیلا ہوا ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں پھینچ لیا۔

”استاد! نصیر کے ہونٹوں سے یہ لفظ اہل پڑا۔“

”کون ہو؟“ سرزاز نے اسے پہچان لینے کے باوجود استفسار کیا۔

”میں نصیر ہوں استاد!“

”نصیر! استا۔ مر گیا ہے۔ یہ اس کی لاش ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔ جاؤ۔ چلے جاؤ۔“

”نہیں۔ نہیں استاد! میں نہیں کیسے جھوڑ سکتا ہوں۔ بتاؤ یہ کیا ہو گیا۔ کیسے ہو گیا۔ تم

سڑکوں پر۔۔۔ استاد! میں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ خدا را بتاؤ! سرزاز نے اپنا سر دونوں زانوں میں پھیلایا

”استاد! استاد بتاؤ! نصیر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔“

”زانو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ یہاں یوں نے کیس کا نہیں دکھنا۔ بتاؤ یہ ہوا ہو گیا ہوں۔“

”موت نہیں آئی۔ بے غری سے جی رہا ہوں۔“ سرزاز نے اسی حالت میں یہ لفظ کہہ کر مراد

چھپا لیا۔

”استاد! چلو گھر چلیں۔“

”کس کے گھر۔ کیسا گھر؟“

”قبلے گھر۔ سٹی گیٹ والے گھر۔“

”سرزاز دو تین لمبے خاموش رہنے کے بعد بولا۔“

”نصیر! میں کرایہ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے۔۔۔ ایک نے مجھے نکال دیا۔ گھر میں جو

کچھ تھا۔ چھین لیا۔ کچھ نہیں رہا۔ میرے پاس کچھ نہیں رہا۔“

”سرزاز کا بدن بڑی طرح لودہا تھا۔“

”نصیر کا اپنا سر جھک گیا۔ تانگے والا یہ منظر بڑی برکت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھے سے اذکر

ان کے پاس ہی آگیا تھا۔“

”استاد! میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں لے جاؤ گے؟“

”جہاں مجھے پناہ ملی ہے۔“

نصیر نے کچھ دنوں کی مدد سے سرزاد کو اٹھا کر تلنگے پر بٹھایا اور تلنگے میں کی طرف جانے لگا۔

حاجی صاحب اپنے چند عقیدت مندوں کے ساتھ مسجد کے دروازے پر کھڑے تھے جب

تلنگہ واپس پہنچا تو وہ تلنگے میں ایک اپاہج آدمی کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

نصیر نے سرزاد کو تلنگے سے اٹھا کر اسے آہستہ آہستہ مسجد کی طرف لے آیا۔

”یہ کون ہے درویش آدمہ بھوے“

”یہ اپاہج آدمہ دست۔“

”اسے کیوں لے آئے ہو؟“

نصیر ایک منٹ خاموش رہا اور مسجد پر نظر میں جمائے کھڑا رہا۔

حاجی صاحب: ”میں نے سوچا تھا، اللہ کے گھر میں مجھے پناہ ملی ہے تو اسے بھی مل جائے گی۔“

نصیر و فقرہ کہہ رہا تھا اور حاجی صاحب کا ایک عقیدت مند ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا جسے سن کر ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”یہ تہہ اپاہج آدمہ دست ہے۔ چودہ اپکا زانی گرامی گرہ کٹ۔“ کہتے یہاں لے آئے ہو۔

پاگل ہو گئے ہو درویش!“

نصیر سرزاد کو سہارا دیئے کھڑا تھا اور وجہ سے اس کا جسم جھکا ہوا تھا۔

حاجی صاحب: ”میں بھی اسی کا ساتھی تھا۔ میں بھی مری کچھ تھا۔“ حاجی صاحب: ”

حاجی صاحب کی سونچوں کے بال شدید غصے میں پھر پھڑانے لگے۔

”تم اس کے ساتھی تھے۔ تم بھی۔ بد معاش، باجی، میں نے تمیں درویش بھجھا تھا۔“

”تم۔ دفع ہو جاؤ۔ تہہ کے لئے بھی یہاں کوئی جگہ نہیں۔ دفع دور ہو جاؤ۔“

حاجی صاحب کی گرجتی ہوئی آواز فضا میں اس طرح گونجی کہ کوئی گھروں کی کھڑکیاں

کھلی گئیں۔

”ٹھیک ہے حاجی صاحب۔“

نصیر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا ہنڈل نکال کر حاجی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔
 ”آپ کی امانت! اور یہ کہہ کر اسی نے سرفراز کو اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔

”چلو اس د! ایک برا گھر چلی ہے۔“ شاید وہاں پتاہ مل جائے۔“ نہ لی تو سزا کیس میں۔
 باغ میں۔ گھنیرے درخت ہیں۔ ان کے ساروں میں جی بیس گئے۔“ بھٹوڑی دیر بعد رات
 کے اندھیرے میں ایک ٹانگہ سستی میں سے نکل رہا تھا۔

کاغذ کی ناؤ

اس سال کی یہ فیسری تقریب بھی جو راشد کے گھر میں ہو رہی تھی، پہلی تقریب فروری کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی اور یہ ایک مجلس سولہ وقت تھی۔ دوسری تقریب ایک سالگرہ تھی۔ راشد کی سہ ماہی کی جو چہرہ روز کے لئے اس گھر میں آگئی تھی اور اتفاق یہ کہ چودہ جولائی کو اس کی سالگرہ کا دن تھا جب وہ وہیں مقیم تھی تو بچہ کی تانی اس وقت کو کیسے ضائع کر سکتی تھی انہوں نے شاید وہ کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی اور بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ اور اس روز اس کے اپنے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ دن ستاس نوہر کا تھا اور راشد کی امی بہنوں سے اس کی تیاری کو رہی تھیں۔ محلے کے اندر اور محلے کے قریب دھواں میں جتنے بھی بڑے گھر تھے وہاں جا جا کر وہ گھر والوں کو بالخصوص لڑکیوں کو سالگرہ میں شرکت کی دعوت دے آتی تھیں اور انہیں توجہ تھی کہ اس مرتبہ وہ اس مقصد میں نذر کا سیلاب ہو جائیں گی جو ہر تقریب کے برپا کرنے میں ان کے پیش نظر رہتا تھا۔

تقریب رات کے لوہے تک جاری رہی بڑی مدقت رہی، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راشد کی امی نے جن جن لڑکیوں کو مدعو کیا تھا وہ سب کی سب آگئی تھیں۔

راشد جب ٹھک ٹھکا کر اپنی خرابی گاہ کی طرف جا رہا تھا تو اس کی امی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور اپنے قریب آنے کے لئے کہا۔ راشد جاتا تھا کہ وہ کیا ہو چھیں گی اس لئے وہ مسکرا کر کہنے لگا، "چھوڑو نا امی! ہر بار کیا قصہ لے جھپٹی ہیں آپ بہت ابھی قریب ہوئی بہت خوبصورت تھنے لے اور کیا چاہیے؟"

مگر راشد کی امی کو نہ تو ساگرہ کے شاندار مہرنے سے کوئی ڈھکی تھی اور نہ غلامی سے کوئی سوکھا۔ وہ تو یہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ اس کے ضدی بیٹے کو کوئی لڑکی بھی پسند آئی یا نہیں۔ تین سال سے وہ ایک ہی رٹ لگاتے جا رہا تھا۔ امی! جب تک مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آئے گی میں شادی کے معاملے میں ہاں نہیں کہوں گا۔ اور اس کی امی کسی نہ کسی بہانے سے درجنوں کے حساب سے لڑکیاں اسے دکھا چکی تھیں مگر کسی موقع پر بھی "ہاں" اس کے ہوتوں سے نہیں نکلی تھی۔

اس کی وجہ ہاں اپنی بڑی لڑکی کی شادی کر چکی تھیں۔ لڑکی تو بڑی ہی ہے کسی غریب کے گھر کی راحت۔ وہ جلی گئی تو ماں کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کے بیٹے کا گھر آباد ہو اور وہ برابر تین برس سے اسی گھر و دو میں مصروف تھیں لیکن ان کی ہر کوشش ایسی ناکام ثابت ہوئی تھی۔

• راجہ جٹا! کچھ بول تو! راشد کی امی کا بوجھ بہت حد تک ہلچلا تھا اور راشد اس کو بھٹاتا تھا لیکن یہ جواب دینے سے خود کو تھک چکی تھی۔

• ٹھیک ہے امی! ٹھیک ہے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنی انی کو وہ عام طور پر اسی طرح ناکام کرتا تھا۔

• کچھ کہو تو! امی کچھ کہلو اپنے پر سر تھیں۔ انہوں نے کتنا وقت صرف کر کے کتنی زحمتیں کر کے اتنی ساری لڑکیوں کو جمع کر لیا تھا۔ ان میں سے تین چار تو ہر لحاظ سے بہت اچھی تھیں۔

• حسین، رحیل، تیلو یا فتنہ اور معزز خانہ لڑکیوں کی جہنم و جہانم، لیکن ان کے بیٹے کی ضد اپنی جگہ قائم تھی۔

• امی! انکو نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آرام کیجئے، بہت تھک گئی ہیں آپ۔ یہ کہہ کر راشد نے جیسا چھڑایا اور اپنے کمرے میں جا کر ہنگ پر گر پڑا۔ فتنہ اس پر غلبہ پالے لگی۔

• ایک ایک خیال اس کے ذہن میں سر رانے لگا۔ زینداب کے بھی اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ نہیں لائی تھی۔ کیا وجہ ہے اس کی؟

فصیحہ کو اس نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ ان کے ہاں آئی تھی۔ بڑی شوخ گفتار لڑکی تھی۔ ایک منٹ بھی خاموشی نہیں بیٹھتی تھی۔ راشد کا ہر طرح مذاق اڑایا کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ اس سے کئی بار ملا اور ہر بار اس نے محسوس کیا کہ فصیحہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ ایک مرتبہ اسے کانٹ کے لٹانے میں بھی دیکھا تھا کہ کئی غلٹیں مذاکرہ تھی جس میں وہ بھی شامل ہوتی تھی اور اپنی حیرانی سے اس نے سارے سامعین پر جاوے گا دیا تھا۔ پھر وہ اس کو کہیں بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی بڑی بہن ہر تقریب میں شریک ہوتی لیکن وہ نہ آئی۔

”وہ کیوں نہیں آئی۔ لیکن ہے اس کی شادی ہو چکی ہو اور وہ کہیں بیرون ملک چلی گئی ہو۔“ اس نے سوچا اور ارادہ کر لیا کہ صبح جب امی سے ملے گا تو ان سے وضیحہ کے نہ آنے کا سبب ضرور دریافت کرے گا۔

نوبے اسے اپنے بنگلہ پہنچ جانا تھا جہاں وہ اسسٹنٹ منیجر تھا۔ پورے نوبے تک اسے یاد ہی نہ رہا کہ رات اس نے امی سے کیا سوال پوچھنے کے بارے میں سوچا تھا۔ جب وہ بالکل تیار ہو کر گھر سے باہر قدم رکھنے والا تھا تو اسے اپنے سوال کا خیال آ گیا۔ اس کی انہی ناشتے کے گندے برتن اٹھا کر ان کی طرف لے جا رہی تھیں۔

”امی! اس نے عدوان سے کہے پاس جا کر اپنی امی کو مخاطب کیا۔
امی رک گئیں۔“

”ریفیڈ کی چھوٹی بہن فصیحہ بھی تھی؟“ وہ نہیں نظر آئی کہیں؟ اس نے سوال کیا۔

”کیسے آ سکتی تھی؟ امی نے جواب دیا اور جس انداز سے وہ اس سے واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ انہیں اس موضوع سے کوئی تمسبی نہیں ہے۔ اس سے پیشتر کہ راشد مزید سوال کرتا وہ دھڑکتی سے گھٹنگو کرنے لگیں جو دھڑکتے ہوئے کمرے سے گزرتا تھا اور انہیں کمرے کے اوپر دیکھنے ہی والا تھا۔

مانند چاہتا تھا کہ اسی دریا کا رخ ہوں تو فصیح کے نہ آنے کی اصل وجہ پوچھے مگر وہ تو ایک ایک کپڑے کا جائزہ لے رہی تھیں اور مانند کو اندیشہ تھا کہ وہ اس کام میں کئی منٹ خود مصروف کر دیں گی اس لئے وہ ہلکے دھڑکے سے بھاگ گیا۔

ہلکے میں بہت مصروفیت رہتی تھی تاہم جب بھی اسے فرصت کے چند لمحے میسر آتے تھے، وہ فصیح کے بارے میں خود سے ایک آدھ سوال پوچھ لیتا تھا۔ مثلاً کیا وہ شادی کے بعد کہیں باہر چلی گئی ہے یا وہ بیمار تو نہیں ہے۔ ماں کے اس جواب نے کیسے آسکتی تھی اسے کچھ مضطرب کر دیا تھا اور وہ صورت حال جلد سے جلد معلوم کرنا چاہتا تھا۔

پچھلی سہ وقت سے یاد آیا کہ وہ چلنے کی ایک دعوت میں مدعو ہے۔ اگر اسے وہاں نہ جانا پڑتا تو وہ لازماً رفیقہ کے ہاں جاتا۔ مگر اتنی مدت بعد جانا اور غیر کسی مقصد کے جانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

دعوت میں خاموشی گزر گیا۔ جب نوکر میز پر سے چلنے کے برتن اٹھانے لگا تو اس نے دیوار پر لگے جوئے کلاک پر نظر ڈالی۔ پورے نو بج چکے تھے۔

”اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ اس نے سوچا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ امی نے اسے دیکھتے ہی کہا: گرم کر دوں کھانا۔“
”نہیں امی وہاں بہت کچھ کھایا تھا۔“

ماں کا موڑ بگڑا ہوا محسوس ہوتا تھا اور وہ اس بگڑے ہوئے موڑ کی وجہ خوب جانتا تھا اس نے ”مستحبہ“ سے بھی ماں کو بلوائیں کیا تھا۔ اور اس بار بھی اس نے انہیں خودی کا ہی احساس دلایا تھا۔

وہ میز پر سے کھانے کے برتن اٹھانے لگی تھیں کہ مانند نے پوچھا۔

”امی! اب کوئی تقریب ہوگی؟ بات پوچھتے ہی وہ مسکرایا تاکہ ماں یہ احساس کرے کہ وہ شرارتاً ایسا سوال کر رہا ہے۔ سنجیدگی سے نہیں مگر ماں نے سنجیدگی ہی سے جواب دیا۔

تم سوچو؟

”یہ کام تو آپ کیا کرتی ہیں امی؟ وہ سکوائے جا رہا تھا۔

ماں دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد بولیں۔ ”میں لڑ چکی۔ تم جانو اور تمہارا کام؟“ امی نے یہ الفاظ کہہ کر پلٹ کر بیٹے کو دیکھا جس کے چہرے سے سکواہٹ کی دھوپ غائب ہو چکی تھی راشد نے چاہا کہ اصل موضوع کی طرف آئے۔ کہنے لگا۔

”امی آپ نے غصہ کیا کہ رفیقہ کتنی بخیرہ تھی۔ اس کی بہن نصیر ایسی نہیں تھی آپ کو معلوم ہے؟“ کتنی شریں سماں کے چہرے پر میزاری کے اثرات چھا گئے اور وہ کچھ کہے بغیر اسی جگہ کی طرف چلنے لگیں۔

راشد نے لباس تبدیل کیا اور پبلنگ پریٹ گیا۔

امی نے اس موضوع پر کچھ کہا ہی نہیں۔ معاملہ کیس ہے؟ سو سکتا ہے وہ اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتی ہوں۔ مگر اہمیت مذہب کی وجہ سے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے۔

وہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ دونوں نے مل کر کاغذ کی ایک کشتی بنائی تھی اور محلے کے اس نشیبی حصے میں جہاں دو درخت لگا ٹاورا کشتی کی وجہ سے مدین فٹ گرا پانی جمع ہو گیا تھا اپنی کشتی بہا دی تھی جب کشتی دور چلی گئی تو راشد نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اس کشتی میں کشتی کے اندر پانی چلا گیا اور وہ نیچے چلی گئی۔ وہ خرد پانی سے باہر آ گیا۔

مذہبانے کیا بات تھی کہ اس وقت راشد کو نصیر کا چہرہ نگین نظر آیا۔

ایسی ضرور لڑکی میں نگین بھی ہو سکتی ہے اس نے ان لمحوں میں سوچا تھا اور اس وقت بھی کہ اس واقعے کو گزرے سا لہا سال بیت چکے تھے یہی سوال اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ ٹانٹے پر ماں سے چند عام سی باتیں ہوئیں۔ انہیں اپنی ناکامی کا احساس تھا یا بیٹے کی ضد نے اس پر وہ کدوا تھا۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔

اتوار کا دن تھا اور یہ عام تعطیل کا دن تھا۔ وہ ماں سے کچھ کہے بغیر باہر آ گیا۔

اتنے برسوں کے بعد رفیعہ کے ماں جاتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ جیسے وہ کوئی ایسا کام کر رہی ہے جس کی اس سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ جس زمانے میں رفیعہ اور نصیر ان کے اہل گھر میں تھے، وہ چار پانچ ماہ یں صرف ایک بار ان کے گھر میں جاتا تھا اور وہ بھی کسی تقریب میں مدعو کرنے کی خاطر یا ان کی کسی تقریب میں شامل ہونے کے لئے۔ اور اب تو اسے کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیا ان کے گھر والے اسے اپنے اہل گھر سے دیکھ کر حیران نہیں ہو جائیں گے اور گورنار سے کچھ نہ کہیں۔ ان کے دلوں میں تو یہ سوال خود سر اٹھنے لگا کہ اگر وہ ان کے اہل گھر سے کیا آیا ہے۔

اس کے قدم رفیعہ کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے اور ذہن میں ایک ایسی کشمکش برپا تھی جو برابر بڑھتی جا رہی تھی۔

مکان ڈھونڈنے میں راشد کو خاصی دقت ہوئی۔ لاہور کے دوسرے علاقوں کی طرح موہنی روڈ کے اس حصے میں بھی بے تحاشا مکان تعمیر ہو چکے تھے جہاں ایک گھر میں اسے جانا تھا۔ رفیعہ کے آبائی تحصیلدار وہ چکے تھے۔ اور گورنار کے نام کی شہرت تھی اس لئے وہ جلد ہی اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

مکان بڑا، نظر آ رہا تھا۔ دروازے کا رنگ دروغن اتر چکا تھا۔ دروازے کے ایک طرف نام کی تختی پر فضل حسین تحصیلدار کے بیٹے سے حرف بشکل رسمے جاسکتے تھے۔ راشد نے کال بیل پر انگلی رکھنے سے پیشتر دو تین لمحوں کے لئے ابھرا دھڑکیا، گویا کوئی غورنا سب کا ردائی کرنے والا ہے۔

گشتی بچے کے ایک دو منٹ بعد دروازے کھولے گئے رفیعہ کی ماں کی آواز آئی لیکن بچہ ”جی میں ہوں راشد، خدہ جان!“

دروازہ فوراً کھل گیا۔

”اے راشد بھائی! کچھ بچہ تم ہو رہا!“

”آپ پہچان نہیں رکھیں خالد جان

کمال کرتے ہو۔ اپنے راشد کو نہیں پہچانوں گی۔ آؤنا باہر دووانے پر کیوں کھڑے ہو۔

رفیع نے سکرا کر اس کا استقبال کیا اور اسے ڈرائیونگ دھم میں لے گئی۔

ہو ایہ خالد جان کو میں ادھر اپنے ایک دوست کے ہاں آیا تھا۔ واپسی پر آپ کے مکان پر

بھی نظر پڑ گئی۔ اس نے یہ بات ڈرائیونگ دھم میں داخل ہوتے وقت سوچ لی تھی۔

رفیع کا جھٹکا بھائی بھی آگیا۔ بڑھاپا آپ بھی میز پر چائے کے برتن بھی ترتیب دیئے جانے

لگے مگر اس سستی کی اس نے بھی ٹھیک ٹھیک جھٹک بھی نہیں دیکھی تھی جس کی خاطر وہ وہاں پہنچا تھا۔

باتیں ہوتی رہیں۔ رفیع اور اس کی ماں، دونوں نے اس سے پوچھا: اب شادی کب

ہو رہی ہے؟

اس کے جواب میں وہ نقطہ سکرا دیا۔

جتنی دیر کی باتیں تھیں سب تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ اب اسے چلا جانا چاہیئے تھا۔ وہ اٹھ اٹھا۔

”خالد جان! اس کے لیے میں جھجک گیا ہوں تھی۔

”وہ۔ ہاں خالد جان! فیصلہ دکھائی نہیں دی۔ اس نے پوچھا۔

رفیع کی ماں نے ایک لمبی آہ بھری۔ کیا دیکھ کر کہہ گئے بیٹا:

”کیوں۔ کیا بات ہے؟ راشد نے پوچھا۔ مگر اسے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔

ڈرائیونگ دھم سے نکل کر وہ مہن میں آیا۔ ایک کونے میں کرسی کے اوپر لمبھوں کے درمیان

کوئی اخبار پھیلا ہوا تھا جس کے پیچھے یقیناً کوئی چہرہ چسپ کیا تھا۔

”فیصلہ جی! راشد آیا ہے؟

ماں کے یہ الفاظ سن کر فیصلہ نے اخبار بٹا دیا۔ اب راشد اپنے سامنے، تھوڑے سے خاصے

برس اس چھوٹے کو دیکھ رہا تھا جو کم از کم بارہ برس بعد اسے دکھائی دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے

اس چہرے پر سکڑا ہٹ آئی۔ مائیں اُنھ سے اس نے سلام کیا اور پھر بلا کی انگریزی اس پر چھا گئی۔

”راشد! ایکٹنٹ میں ایک گاڑی نے میری بجلی کی ٹانگیں کھل دیں۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی: گھر سے نکلتا مشکل ہو گیا۔ کہیں آتی جاتی نہیں میری بجلی۔ راشد نے اب دیکھا کہ فیصلہ دہیل جیڑ پر بیٹھی تھی۔ وہ خاموش تھی، آنکھیں جھکی ہوئی بے جان دکھائی دے رہی تھیں۔

”کیا یہ وہی شریر فیصلہ ہے جو ایک لمحے کے لئے بھی چپ نہیں ہوتی تھی اور اب کتنی خاموشی افسردہ و بزمودہ ہے۔ راشد نے گھر کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے سوچا اور اس وقت بھی یہی احساس اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا جب کھانا کھانے کے بعد تازہ اخبار کی غایاں سرخیوں پر ایک اجنبی ہونی نظر ڈال رہا تھا۔ اس کی امی اس کی طرف اس موقع سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ کچھ کہے گا۔ کچھ پوچھے گا۔ کسی اہم واقعے کا ذکر کرے گا لیکن وہ خاموشی چھایا انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ راشد کچھ کہنے سننے کے موڈ میں نہیں ہے اس لئے اپنی کرسی سے اٹھنے لگیں۔ اخبار کا ایک ورق میز کے اوپر الگ پڑا تھا۔ انہوں نے یہ ورق اٹھا لیا اور اسے اپنی آنکھوں کے قریب لے آئیں۔ راشد بیٹا! آج کل ضرورت درشتہ والے اشتہار زیادہ چھپنے لگے ہیں۔

راشد کے چہرے پر ایک بھیگی سی سکاہٹ آئی اور دوسرے ہی لمحے میں غائب ہو گئی۔

”تم فیصلہ کیوں نہیں کرتے؟ ماں نے پوچھا۔

راشد خوب جانتا تھا کہ ماں کا اشارہ کس فیصلے کی طرف ہے مگر اس نے انجان بن کر پرچہ: کس بات کا فیصلہ؟

تم نہیں جانتے۔ تہااری ماں تم سے کس بات کا فیصلہ چاہتی ہے۔ کج تہادی بہن آئی گی کہتی تھی بھائی جان ٹال ٹال سول کیوں کر رہے ہیں؟

”دقیقہ، کو تو ارد کچھ سوچتا ہی نہیں امی۔

راشد نے اپنی طرف سے اس موضوع پر مزید گفتگو کا اندازہ بند کر دیا اور وہ اخبار کھڑک کر سی سے اٹھنے لگی رالاستا کہ ماں بولیں۔

ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ تم سے عمر میں صرف دو سال بڑی ہے اس کی شادی ہو چکی ہے
 دو بچوں کی ماں بھی بن گئی ہے اور ایک تم ہو کر :

رائد جانے لگا۔ ہو جائے گا امی! ہو جائے گا آپ کی ہونے والی بہو کہیں جہاں نہیں جاتی
 یہ الفاظ کہہ کر وہ دروازے پر پہنچ گیا۔

”تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟“ انہوں نے بیٹے کو روکے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
 ”ابھی لوٹ آتا ہوں!“

وہ غم رکھتے کاشانی نہیں تھا مگر اس رات اس نے دو مراغہ دیکھا اور دیر سے گھر بیٹھا اور
 جب ستریا قریب بار پھر دی اندر وہ چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا جسے اس نے
 چند لمحے پہلے دیکھا تھا۔

”اس نے صرف سلام کیا تھا اور وہ بھی صرف ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا نہیں تھا۔ ایک
 لفظ تک اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلا تھا۔ ایک ایکسٹنٹ میں گاڑی نے میری پی کی ٹانگیں
 کچل دیں۔ فیصہ کی ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ خامی دیر کے بعد اس کی آنکھوں
 میں آنسو آئی اور سونے سے چند لمے پہلے وہ اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا۔
 ملی النسخ امی نے ناشتا لگایا تو بولا: امی آپ میرا فیصلہ سننا چاہتی تھیں نا۔

امی جو زانی اندھے کی بیٹی۔ بیٹے کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ سانس روک کر اسے دیکھنے لگیں۔
 ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے امی۔“

”اللہ تیرا شکر ہے۔ بتا دو نا۔“

”امی! میں فیصہ سے شادی کر دوں گا۔“

ماں کی یہ کیفیت ہونی جیسے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے۔ جب ان کی حالت کچھ
 سنبھلی تو انہوں نے پوچھا: بیٹا رائد! تمہارے کیا کہہ رہے۔

بیٹا جانتا تھا کہ اس نے جوابات کہی ہے وہ ماں نے پوری طرح کھول لی ہے اور امی بھی جانتی

نہیں کہ بیٹے کو اس کا علم ہے۔

۱۰ ای! میری خوشی ہی میں ہے:

”بیٹا! تم کیا کہہ رہے ہو؟“

ماخذ: اثبات کرنے لگا۔ ماں اسے ٹھٹھکی بانٹھ کر دیکھ رہی تھی۔

۱۱ ای! نصیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا۔ بہت۔ اچ۔ اچ۔ چ۔ چھی۔ ای!

”تم کچھ کہہ رہے ہو؟ ای! اسی طرح دیکھ رہی تھیں۔“

”میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ ای!“

”نہیں! شاید شاید تم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔“ ای! نے اپنا رایاں اٹھ اس کے شانے پر رکھ

دیا۔ وہ اسے اس انداز سے دیکھ رہی تھیں جیسے جو کچھ اس نے کہا ہے وہ اس کا فیصلہ نہیں ہے۔ وہ ایسا فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔

۱۲ ای! آپ غالباً سمجھتی ہیں کہ میں نے سچائی سے یہ الفاظ نہیں کہے مگر پوری سچائی سے

کہے ہیں۔ دیکھیے ای! اگر آپ کو اپنی بہو کا انتخاب خرد کرنا پڑتا تو آپ کو اس تردد کی کیا ضرورت

تھی۔ آپ کیوں فقرہ نہیں کرتیں۔ کیوں اپنی دیر تک انتظار کرتی رہتیں۔ فیصلہ صرف آپ کو کرنا

پڑتا تو میں کوئی اعتراض نہ کرتا مگر یہ حق آپ نے مجھے دے دیا۔ میری خوشی کا خیال رکھا۔ کیوں ای!

میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

اس کی ای! نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”توضیح آپ کی یہ ہے نا؟“

”مگر بیٹا! وہ تو۔۔۔“

۱۳ ای! اس کی تاہیں بے کار ہو گئی ہیں۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ۔ صرف تاہیں ہی بے کار

ہوتی ہیں۔ زندگی تو بے کار نہیں ہوتی۔ ای! اندرا سوچے تو اتفاقات پر کسی کو کیا اختیار ہو سکتا ہے؟

ای! خاموش رہیں۔ رات کے ٹھوس کر دیا کہ وہ اب اس مسئلے پر کچھ کہنا سنا نہیں چاہتیں۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور راشد باہر نکل آیا۔

اسی شام وہ درندے کے گھر میں کافی ہل دیا تھا اور بار بار اس دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا

تھا جس کے عجیبے فیصلوں کی سبیل سے باتیں کر رہی تھی۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔

راشد نے دیکھ لیا کہ اس کی پہلی کمرے کے دروازے سے نکلے ہوئے تیرے بڑے بہن بھائی ہیں۔

اس نے پیالہ اٹھوڑ میں رکھ دیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

”آپ کب آئے؟“

”بندہ جس منٹ ہوئے ہیں۔“

فیصلو نے استفسار طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔“

راشد نے درجن گھونٹ پی کر پیالی میز کے اوپر رکھ دی۔ فیصلو نے اپنی آنکھیں جب کالی تھیں

”فیصلو مجھے حرت یہ کہنا ہے کہ میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ آپ

میرا ساتھ دیں گی؟“

فیصلو کی نظریں اوپر اٹھیں اور راشد جلدی جلدی قدم اٹھاتے دکھا۔

آٹھ روز کے بعد فیصلو دہلیں بن کر راشد کے گھر میں آ گئی۔ سب موسم بڑی سادگی سے ادا

کی گئیں۔ فقط بہت قریبی عزیز غریب میں شامل ہوئے۔ بہنوں کو اس واقعے کا علم ہی نہ ہو سکا

راشد کی ایسا بظاہر کچھ بھی کسی نظر آئی تھیں۔ تاہم ان کا رویہ ایسا تھا جس سے بہو کے ساتھ کسی

بیرونی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی

تھی کہ فیصلو کو کوئی دقت اور تکلیف نہ ہو۔

راشد ماں کے اس رویے پر مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ ہو لے اس پر اس کی ایسی نظما

خوش نہیں ہیں مگر وہ پہلی جانتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ گھر کے ماحول میں کوئی

تعلقی پیدا نہیں ہونے دیں گی۔

نصیبو شرمانی شرمانی سی رہا کرتی تھی۔ راشد بھٹتا تھا کہ اس کا اس طرح غرانا کئی ملکان
تو قے چیز نہیں ہے۔ ہر وہی سسلاں میں شرایا ہی کرتی ہے وہ اسے لطیفے مانا کر جانے کی
کوشش کرتا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ اس کے قریب رہتا تھا سات دن چھٹی کے گزر گئے تو اس نے پتا
یہ معلوم کیا کہ ایک سے یہ جاگھڑا آتا اور کئی نہ کوئی چیز مٹھائی یا پھل لے کر آتا۔

وہ سینے بہت گھنے نصیبو کا وہی انداز رہا۔ وہی جھکی جھکی نظریں وہی کم گوئی اور وہی
سرد تفریح سے وہی نہ لینے کا اظہار۔

ایک دن موسم بڑا سہانا تھا۔ چار بجے چائے پینے کے بعد راشد کی ماں تو گھر کے انتظام
میں سرگرم ہو گئیں اور راشد نے نصیبو سے کہا: دیکھیں جو موسم ہے نا پڑ لطف کیا خیال ہے
باہر گھر سے بیٹیں؟

نصیبو چند لمے تو چپ رہی پھر کہنے لگی: جی چاہتا ہے تو چلے جائیں۔
تمہارے ہنر؟

اس میں حرج ہی کیا ہے؟

”بہت حرج ہے نصیبو تمہارے ہنر میرا خاک لطف آئے گا؟
نصیبو کسی سوچا میں نہ گئی۔

”کیا تم پہلے اس حالت میں گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں؟
نصیبو نے کوئی جواب نہ دیا۔

دہلی جیسے بڑی آسانی سے ٹیکسی میں رکھی جاسکتی ہے تھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی
راشد اسے جناح باغ لے گیا۔ اسے ٹیکسی سے اتارا اور دہلی جیسے ایک طرف سے
جانے لگا۔

”بڑا لطف آ رہا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو اتنے ایک بہت خوبصورت بچے گاڑی میرے
لے کہیں باہر سے منگوا دی تھی ایک ملازم لے اس گاڑی میں بٹاکر باغوں میں گھلتا پھرتی تھی

اور آج۔ کیا سوچ رہی ہو نصیر؟

نصیر خاموش تھی، اس کے مومنت ایک رزنی خفی سے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پٹوں پر سنانے سے لرزے ہوئے غصے جھڑکتے تھے۔ راشد کے ہاتھ رک گئے اور وہ اس کے خاموش زرد، ضرورہ چہرے کو دیکھنے لگا رہا تھا۔

”نصیر بتاؤ تو یہ کبھی سوچ ہے؟“

نصیر نے زبان سے کوئی لفظ اور نہ کیا حرکت ملی میں سر ہلا دیا۔

راشد وریل بیئر کو گلاب کے سرنے جھولوں سے بھرے ہوئے ایک پارے کے قریب لے آیا۔

”نصیر! یہ پیرل کتنے خوبصورت اور پیارے ہیں، تم انہیں ایک بھول ہو؟“

نصیر مسکرائی، راشد وریل بیئر کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔

ہر طرف ہوا کے سرد جھونکے بہہ رہے تھے، فٹناریں ہرندے اڑ رہے تھے اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے بڑی تیزی سے اپنے پرزوں کو حرکت دے رہے تھے، ایک قطار جلنے کے بعد ایک پرندہ کچھ فاصلے پر غلط آ رہا تھا۔ راشد اس پرندے کو دیکھ رہا تھا اس کا سایہ ایک لمحے کے لئے نصیر کے چہرے پر پڑا اور پھر جب اس پر چھائی ہوئی انورہ کی ایک جھلک نظر آئی۔

”نصیر! میں خوش تھا کہ تم مسکرائی ہو مگر اب پھر خاموشی اور انورہ کی جھلکی ہو، ایسا ہونا نہیں چاہیے، تمیں کرنی کی غصے جھڑکتی ہے، کوئی دکان سے جس کا اخبار کرنے سے خود کو تاحصر سمجھتی ہو یا مناسب نہیں، کبھی تو اسے نصیر! جس کی بروہ داری ہے؟“

راشد نے اپنا سر اس کی کمری کے بازو سے دھکا دیا تھا اور اسے خود غصے جھڑکتا جیسے وہ یہ الفاظ عام بچے میں نہیں مڑکائی کے انداز میں کہہ رہا ہے۔ کیا وہ چاہتا نہیں تھا کہ یہ بات اس سے کہے

نصیر کی ٹھیکس جھکی ہوئی تھیں اور ان چکوں کے نیچے رخساروں کی سفیدی جیسے کبھی شفاف تھیل کے بانوں پر روضوں کی ایک لمبی قطار کا سایہ پھیلا ہوا ہو۔

”راشد! اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا: ”انسان کبھی کبھی ایک جذباتی فیصلہ کر بیٹھتا ہے وہ جذبات کی مدد میں بہہ جاتا ہے، نہیں سوچ سکتا کہ اس کے فیصلے کا انجام کیا ہو گا۔ وہ کن نتائج سے دوچار ہو گا۔ میں جانتی ہوں تم نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرتے وقت کچھ سوچا نہیں تھا، اور مجھ پر بھی بالکل نہ سوچنے کی پابندی لگا دی تھی۔ کہا تھا تم نے تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا تم میرا ساتھ دو گی۔ میں نے ساتھ دے دیا۔ تم نے اٹھ بڑھایا اور میں نے اپنا اٹھتے تھا دے، اٹھتے میں دے دیا۔“

فصیحہ کہے جا رہی تھی: ”اگر تم نے نہیں سوچا تھا تو کم از کم مجھے ہی — لیکن میں — میں راشد! جب تم نے وہ لفظ کہے تھے تو تباہی آنکھوں میں ایک ایسی سرخی چھلکنے لگی تھی جو ایک بہت مضبوط اور ناقابل شکست اور اسے کی علامت ہوتی ہے جو ایک ایسا شہر دوچار ابن جانی ہے جس میں سب کچھ بہہ جاتا ہے تم مجھے ملے آئے میں آگئی۔ آگے کتنا طویل کس قدم۔ چھوہ دنا ہمارا ایک راستہ پھیلا ہے یہ راستہ کہہ جاتا ہے کس منزل کی طرف جاتا ہے۔ راشد! ہم کہاں پہنچیں گے! میری چیز دھکیلتے ہوئے کہاں لے جاؤ گے؟“

راشد سنا دیا اور اس کا چہرہ کرسی کے بازو سے الگ ہو گیا۔

”فصیحہ! ہر انسان کا راستہ پیچیدہ ہوتا ہے زندگی تو پیچیدہ راہوں پر سے گزرتی ہے۔ میں نہیں دھکیل کر کہیں نہیں لے جاؤں گا۔ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ میں ہر قدم پر اپنی مددشن منزل لے گی میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔“

فصیحہ نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں راشد کہ وہ اپنے سینہ لباس میں لمبوس کاغذ کی اس کشتی کی طرح نظر آ رہی تھی جسے ان دونوں کے بہت مدت پہلے ایک گڑھے کے پانی میں بہا دیا تھا۔

”فصیحہ! کاغذ کی ناؤ اور پیار کی ناؤ میں بڑا فرق ہے کاغذ کی ناؤ پانی کی بہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر پیار کی ناؤ تو طوفانوں سے گزر کر ساحل پر جا پہنچتی ہے۔“

ٹکھو غافلوں سے گزر کر:

”کیوں نہیں فنیو! مجھے تہاری یہ بات سنی بالکل پسند نہیں۔ ہنسنا، مسکراؤ، میں نہیں وہ سب کچھ نہ دے سکا جو مجھے دینا چاہیے تاہم جو کچھ دے سکا ہوں وہ تو دے دیا ہے۔“
 فنیو کی چٹکوں پر کچھ چمک رہا تھا اس نے ڈیڑھی اور تھوڑی آواز میں کہا: ”راشد! تم نے بہت کچھ دے دیا ہے، مگر میں نے کیا دیا ہے۔ میں کیا دے سکتی ہوں۔“

اس نے اپنی دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے، راشد نے اٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ آنکھوں سے ہٹائے۔

”ایسا مت کہو فنیو، تم نے بہت کچھ دیا ہے تم میری زندگی میں آگئی ہو۔ اس سے زیادہ کیا دے سکتی ہو؟ راشد کا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل قریب جھکا ہوا تھا۔“

”تہہ دی زندگی میں آگئی ہوں، کچھ ساری ٹائمنس لے کر۔“

فنیو نے دوبارہ اپنے ہاتھ آنکھوں کے اوپر پھیلا دیئے۔

”اس سے کیا ہوتا ہے فنیو؟“

اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ پوچھتے ہو مجھ سے۔ اپنی اسی کو دیکھ رہے مجھے دیکھتی ہیں تو اس کی آنکھوں میں کتنی باتیں ہوتی ہے۔ کتنا دکھ، کرب، ہوتا ہے۔“

”جے وقف مت ہو فنیو!“

”میں کچھ نہیں بن سکتی، کچھ نہیں، دکھ کا ڈھیر۔ دکھ کا ڈھیر، فنیو جب یہ الفاظ کہہ رہی تھی تو اس کا سارا بدن کانپنے لگا تھا۔“

”نہیں فنیو نہیں!۔۔۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے میری بات نہیں مانو گی۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تم سے کیا کہہ رہا ہوں فنیو، تم سے جو میری اپنی ہو۔ میں اپنی فنیو سے کہہ رہا ہوں۔“

فنیو نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے، لمحہ بہ لمحہ اس کی اندرونی طوفانی کیفیت ختم ہونے لگی۔

اس وقت تم کتنی اچھی لگتی ہو۔ راشد نے مسکرا کر کہا اور فنیو کی آنکھوں میں قسم کی ایک

ہنگی میں لہریوں ابھری جیسے درافق کا کوئی گناہ سودج کی آڑ میں کرن سے چمک اٹھا ہو۔
 دن گزرتے گئے، دھیرے دھیرے، جیسے وقت کسی یگر بھار دلتے پر سفر کر رہا ہو۔ اس گھر
 میں بیٹوں کی ذہنی کیفیتیں مختلف تھیں، راشد فصیح کے ٹکے میں اپنے بازو جاکر دیتا تھا۔ اسے
 کوئی نیا مٹیف سٹا تھا۔ کوئی مزیدار بات، فصیح زور سے قہقہہ لگاتی تھی تو اس کی آنکھوں میں
 ایک چمک سی آجاتی تھی۔ پھر چند لمحوں کے بعد یہ چمک ڈب جاتی تھی اور راشد غصوں کرتا تھا کہ
 فصیح چرا بھی اس کے بالکل قریب بیٹھی تھی جس کا چہرہ اس نے اپنی گرت میں سے رکھا تھا جو
 ہنس رہی تھی، اچانک کہیں چلی گئی ہے۔ کہیں غائب ہو گئی ہے۔ اور وہ اسے ڈھونڈ رہا ہے۔
 اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

ایسے میں وہ فصیح کو دوسرے آواز دیتا۔

فصیح خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگتی۔

راشد راشد کو اس کی یہ آواز کہیں بہت دوسرے آتی ہوئی لگتی۔

فصیح بیک وقت دو دنیاؤں میں جی رہی تھی۔ ایک دنیا بہت تاناک اور دوسری بڑی
 تاناک۔ ایک دنیا میں ماضی بٹے ہوئے وہ جلد گھبرا جاتی۔ اور بے اختیار وہی کے عالم میں یہ
 دنیا پھوڑ کر دوسری دنیا میں چلی جاتی۔

آدھی آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اپنے پہلو میں وہ راشد کو دیکھتی۔ پیرا شوہر
 ہے۔ پیری دنیا۔ میرا محبوب۔ میرا۔۔۔ میرا۔۔۔ وہ اسے دیکھتی رہتی۔ اچانک اندھروں کی
 دنیا اسے آواز دے کر بلا لیتی۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ میں کیا ہوں۔ اپنا بیچ۔ محتاج۔ ایک ناکارہ
 وجود۔ وہ تیزی سے خود کو چھپے بنا لیتی۔ ایک ہنگی سی اس کے گلے میں چھنس جاتی۔

راشد کی ای چپ چاپ اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ صبح سویرے ناشتا کیا کرتی
 تھیں اور عدول کو ناشتا کرواتے تھیں، ہونٹ لٹے کے بعد اخباروں کے مطالعے میں مصروف ہو جاتی

تھی تو وہ سودا سلف لانے کے لئے بازار پہلی جاتی تھیں۔

راشد کا اسلام آباد میں تبادلو ہو گیا۔ لاہور میں اسسٹنٹ منیجر کے طور پر کام کرتے ہوئے اسے تین برس گزر چکے تھے اور اب اس کی ترقی کا امکان خاصا روشن تھا۔ اسے ترقی دے کر براؤنچ منیجر بنا دیا گیا۔ جب اسے اس امر کی اطلاع ملی تو اسے خوشی ہوئی لیکن جلد ہی یہ خوشی ٹھکرنے میں بدل گئی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ کیا فیصلہ کرنے والوں سے مانوس ہو سکے گی۔ یہاں پہنچتے ہیں کم از کم ایک بداس کی بہن دیکھ آجاتی ہے۔ رفیعہ نہیں آتی تو سہائی سروراز پر پہنچتا ہے۔ اسلام آباد میں یہ ممکن نہیں ہے۔

اس نے گھبرا کر بیوی کو یہ خبر سنائی تو اس کے چہرے پر کوئی ایسا فیئر رد نہ ہوا جس سے اس کے ذہنی رد عمل کا اظہار ہوتا۔

دس روز بعد وہ تینوں اسلام آباد کے ایک کوارٹر میں تھے۔

راشد کو غنی خنسا میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا تھا البتہ وہ یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ اس کی بیوی کی کم گزرتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ساس سے تو وہ پہلے ہی محرت مطلب کی بات کرتی تھی اور اب تو وہ ان سے کچھ اور درد ہو گئی تھی۔

فیصلہ طور پر کے بک جانے کے بعد زیادہ تر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی تھی۔ رسالوں کا مطالعہ کرتی۔ سہتی یا کھڑکی کے قریب جا کر اس پر کھیتی رہتی۔

ماشک ای امی اگر کہیں نہ چلے لاؤں۔

• خالہ جان! تکلیف نہ کریں۔

راشد کو گھر آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ فیصلہ کو کھانے کے لئے ڈانٹنگ و دم میں پھٹنے کے لئے

کہتیں مگر وہ نفی میں سر ہلا دیتی: نہیں خالہ جان!

• تمہیں بھوک نہیں لگی؟

• نہیں، بالکل نہیں۔

ماس منہ سے کچھ نہ کہتیں، مگر جلتے ہوئے جب زور سے کمرے کا دروازہ بند کرتیں تو صاف معلوم ہو جاتا کہ انہیں اپنی بدبو کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں ہے۔ راشد گھر لوٹتا تو جب معمول اپنی امی سے پوچھتا، ہر طرح خیریت ہے نا امی؟

”اس خیریت ہی خیریت ہے۔ یہ تھکادی ہوئی کر بھوک لگتی ہے نہ بیاس؟ راشد ہنس پڑتا۔ امی! آپ کیا جانیں میری ہوئی کتنی صابر و شاکر ہے۔“

راشد قہقہہ لگا کر اس تلخی کو اپنی طرف سے ختم کر دیتا، جس کا احساس اس کی امی کے لفظوں سے ہوتا تھا مگر آہستہ آہستہ خود بھی اس کے دل میں ایک ناخوشگوار سا جذبہ سر اٹھانے لگا تھا۔ فیصلہ کچھ دیر اور کدوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی، کبھی کبھی وہ اس طرح اپنے اندر ڈوب جاتی تھی کہ شہر کی آواز کا بھی اسے احساس نہیں ہوتا تھا۔

”فیصلہ! کیا حال ہے؟“

فیصلہ اسے یوں دیکھتی جیسے اس کے شوہر نے اس کے خیالوں کی دنیا پر چھاپ دیا ہو۔

راشد اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔

”کتنے خوشبودار مناظر ہیں۔“

”ہوں؟“

”آؤ باہر چلیں۔ وہ اس سے کہتا۔“

”یہاں سب کچھ نظر آتا ہے، باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اسے بال دیتی۔“

راشد اپنا چہرہ اس کے بالکل قریب لے آتا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرنا مگر دلوں اسے سولنے ایسے سایوں کے جو شام ہوتے ہی گنجان درختوں کی شاخوں میں اتر آتے ہیں اور کچھ بھی محسوس نہ ہوتا۔

اس کے ذہن میں خیال آتا کہ کیا یہ اپنے عزیزوں سے دور ہو گئی ہے، اس وجہ سے اس طرح چپ چاپ اور اداس سی رہتی ہے، کیا میں اسے وہ توجہ نہیں دے سکا جو مجھے دینا

چاہئے تھی۔ وہ اپنے اس شبہ کا اظہار کرتا۔

”بہن! راشد: تم نے مجھے بھرپور قہر دی ہے۔ میں قراہا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

راشد اور کوئی بات نہ کہتا اور اسلام آباد کے ایک کوارٹر کی کھڑکی سے دو چہرے لگے اس وقت تک اپنی نگاہیں ادھر ادھر، قریب اور دور بکھیرتے رہتے جب تک ابتدائی رات کے اند چہرے گہرے ہو کر اور گرد کے مناظر کو اپنے دامن میں ڈھانپ ڈھالتے۔

اس دن راشد اور فصیحہ کی شادی کی پورے تین سال گزرے تھے۔ راشد، فصیحہ کے لئے ایک نئی ساڑھی اور ایک نئے شام سے پہلے گھڑا گیا۔ جھن میں اس کی ای کھڑکی تھیں اور راہنوں نے گود میں ہسلنے کا ایک بیڑا رچا۔ اس طرح اٹھار کھا تھا کہ ان کے ہر نٹ اس کے ماتھے کو چھو رہے تھے۔

راشد کو اند آتے ہوئے دیکھ کر اس کی امی نے جلدی سے اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف کر لیا مگر راشد کو ایک ہی لمحے میں ان کی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی حسرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے ان سے کچھ نہ کہا، کمرے میں گیا۔ فصیحہ کھڑکی کے پاس نہیں تھی۔

دوسرے کمرے میں بیوگی۔ اس نے سوچا اور دھڑلے سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس کے کان میں ہلکی سی آواز آئی، کمرے میں قدم بے اذہر اٹھا۔ اس نے اٹھ بڑھا کر بجلی کا بلب روشن کیا۔

فصیحہ کی کرسی دروازے کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور وہ سامنے دیکھ رہی تھی، کمرے کی دوسری کھڑکی میں سے ہر صحن میں کھلتی تھی۔

”فصیحہ! راشد نے بیوی کو مخاطب کیا۔

فصیحہ اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی

راشد اس کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

”فصیحہ! ایک ہے۔“ وہ اس کی طرف جھکنا کہ ساڑھی کا پکٹ اس کے حوالے کرے کہ وہیں

دیکھا جیسے نصیر کا اندرون بند ٹوٹ گیا ہے۔ وہ رونے لگی۔

”نصیر! دیکھو۔۔۔ دیکھو تو۔۔۔“

”کیا تم نے شادی سے پہلے مجھے دیکھا نہیں تھا دیکھو لے آئے تھے۔ مجھ پر کار و چود کو۔ مجھ بابا بچ کو۔۔۔ اس میں میرا کیا قصور ہے، کیا جرم کیا ہے میں نے کیا فریب دیا ہے تم لوگوں کو میں کچھ نہیں دے سکی۔ میں کچھ نہیں دے سکتی۔“

بے اختیار آنسو اس کی آنکھوں سے اور الفاظ اس کے ہونٹوں سے بہتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا سارا بدن بڑی طرح کانپ رہا تھا۔ گنگا تھا کہ وہ اسی طرح کا بہتی رہی تو دیریل چیز سے گھر پڑے گی۔

راشد نے پیکٹ ہنگ پر دنگ دیا اور اس کا بازو ہٹام لیا۔

”نصیر نصیر! ایسا نہیں کہتے۔“

”میں نے کب کہا تھا کہ مجھے اپنی زندگی میں لے آؤ۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ میں کچھ بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیا مجھے پتہ تھا کہ مجھ کو کھانا ہے کہ میں خالی جان کی حسرت نہ مجھ سکوں۔ تہا دی آرزو نہ جان سکوں۔ میں۔۔۔ بیکار رہتی، جگہ ہو، کوئلہ۔۔۔ میں۔۔۔ اور میرے والد۔۔۔ میں مرکبوں نہ لگتی۔ مرکبوں نہ لگتی۔“

راشد نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

”نصیر تم بہت کچھ ہو۔ تم سب کچھ ہو۔ میں کہتا ہوں نصیر! تم میں کوئی کمی نہیں تم بڑا دس میں ایک ہو۔“

نصیر کا ربا ہوا ضبط بھی ختم ہو گیا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے، اس کے اندر شکست و شکست کا مل تیزی سے جا رہی تھا۔

”راشد! راشد کی امی کی آواز گونجی۔ وہ ان کی طرف آ رہی تھیں۔“

”آخر یہ کیا تھا خا ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ کیا بے انصافی کی ہے اسے کیا کچھ نہیں دیا۔ اسے

کبھی سخت بات کہی ہے۔ کبھی بدسلوکی کی ہے۔ اس کا کوئی حق جھینا ہے اس نے ہم سے
ہماری آرزو نہیں جھینیں میں۔ ہم نے تو اس سے کچھ نہیں چھینا۔

راشد بیوی کا بازو اور ہاتھ چھوڑ کر اپنی ماں کی طرف ہٹا گیا۔

ای کیا کرتی ہیں آپ۔ خدا کے لئے غاموش رہیں۔ چپ ہو جائیے امی! اور وہ ماں
کو دردناک سے کی طرف لے جانے لگا۔

”میں بدبختی ہوں۔ یہ بڑی چاہتی کیا ہے آخر؟“

”کچھ نہیں چاہتی امی۔ کچھ نہیں چاہتی۔ خدا کے لئے امی۔ جائے۔ امی جائے۔ امی
بہر جانے لگیں۔“

”ہم نے تو اسے پیسنے سے لگایا تھا۔ زمین پر گرتی ہے تو گرے؟“

ماں چلی گئیں ان کی آواز باہر سے بھی آ رہی تھی۔ یکن واسٹہ اس کی طرف سے گویا

کان بند کر کے تھے۔ وہ بیوی پر جھکا ہوا تھا۔ منیر کاہن اب کانپ نہیں دے تھا۔ اس کی
آنکھوں سے جو کچھ نکلتا تھا وہ شاید شکل چکا تھا اس کا جہرہ زرد ہو گیا تھا بے حس بیجان
راشد ہو گیا۔ اسے بیوی کی یہ کیفیت خطرناک لگی۔ وہ اس کی ماری تو جہ۔ سارا دھیان
ایک ایسے موضوع پر مائل تھا کہ وہ اس کا ہوتا تھا اس کے دل میں پہلی پہلی تلخی مٹم
ہو جانے۔ اس نے مائٹھی پٹنگ سے اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دی۔

”میری طرف سے تمہیں پسند آئی؟“

”مہربانی، شکریہ؟“

”واقعی تمہیں پسند ہے؟“

قصیدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کی بیوی کی کیفیت اطمینان بخش تھی لیکن ایک اندوہنا خوف تھا جو راشد کے باطن میں
ریٹک رہا تھا۔

واحد کو نصیحت آنے والے دنوں میں بالکل نارمل نظر آئی۔ اس کی کوئی حرکت، کوئی بات خلاف معمولی عموماً نہ ہوئی۔

سال کا آخری ہفتہ گزر رہا تھا۔ ان دنوں بک کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ واحد ہر روز دیر سے گھر آتا تھا۔ اور ایک شام وہ سات بجے کے قریب آیا تو پہلی ہی نظر میں اس کی چھٹی جس نے اسے بتا دیا کہ کچھ ہو چکا ہے۔

اس کی امی باورچی خانے میں تھیں۔ طازہ بازار سے کچھ سودا لاکر باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔

”نصیحت کہاں ہے؟ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
طازہ کچھ کہنے کے لئے دکی ہی تھی کہ باورچی خانے میں اس کی امی باورچی تھیں۔
”چلی گئی ہے۔“

”کون امی؟“ واحد کو یقین نہیں آیا تھا کہ نصیحت اس اٹاڑ سے چلی جائے گی۔

”کون جا سکتی ہے۔ اس گھر میں میرے قریے سوا اور کون رہتا ہے؟“

”پر امی! اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”کیوں کرتی۔۔۔ مجھ سے دکی طور پر کہا تھا۔ میں جا رہی ہوں۔ اس کا مہائی ٹیکسی لے کر آیا تھا۔
شہاری جیپتی نے خط لکھ دیا جو کچھ باتا تعدہ منسوب بنا کر آیا تھا۔“

اور اس کی امی ایک بار پھر بیٹ پڑی۔

”یہ ناز۔ یہ غرور۔ ہے کیا اپا بیچ۔ اللہ بچائے ایسے لوگوں سے۔ نہ کسی کے احسان کا خیال۔

نہ اپنی بے کسی کا احساس۔ جو نہ۔ اس کی امی بولے جا رہی تھیں۔ وہ جلدی سے کمرے کے اندر گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

دس ماہ گزر گئے بالکل خاموشی سے۔ واحد لاہور نہ گیا۔ ادھر سے بھی کوئی اطلاع نہ ملی۔

چوتھے مہینے کے دوسرے ہفتے کا پہلا دن گزر رہا تھا کہ وہ بک سے گھر آیا تو اس کی امی

نے اسے ایک خط دیا۔ یہ خط مصیری طاوت سے آیا تھا۔ بہت مختصر صرف ایک سطر تھی۔
 ”میں انتظار کر رہی ہوں۔ آج اپنے خط میں اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔“

اس نے خط پڑھا۔ دوسری مرتبہ پڑھا۔ اس کی امی اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔
 ”کیا ارادہ ہے؟“ ماں نے سوال کیا۔

”اس نے مجھے بلایا ہے۔“

ان کا بھروسہ ایک غلط سرخ ہو گیا۔ تم نہیں جاؤ گے۔ کیا ہم نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ کیا
 ہم نے اضافہ بھی کیا تھا کہ اپنے بچے چلی جاؤ۔ خود گئی ہے۔ خود آئے۔
 ”گمراہی دیکھئے تو۔“

”کیا دکھانا چاہتے ہو اب۔ تم نے جو کہا وہ کر دکھایا۔ میں نے کوئی رکاوٹ ڈال دی۔ تم کو منع
 کیا۔ میں نے تو اس کے ساتھ اپنی عمر میں کو بھی لگے سے دکھایا۔ اور کیا چاہتے ہو۔ خود آئے۔
 اس گھر کا دروازہ کھلا ہے۔ نہیں آتی تو نہ آئے۔“

اس نے ماں کی آنکھوں میں آنسو اتار دیا۔ اس وقت دیکھتے تھے جب اس کا باپ دنیا سے
 رخصت ہوا تھا یا اب دیکھ رہا تھا۔

”رہ نہیں امی، دو نہیں۔ اور وہ ماں سے بہت عجیب۔“

خالی خالی کمرہ اور اس دیوار میں ایک گہرا کب سا ہوا۔

راشدہ خود کو بے اختیار کرسی میں گما دیتا۔

کیا اس کمرے کی دیوار اس سے خفیہ؟ اس کی شخصیت میں کتنا اثر تھا کہ اس نے اس کمرے
 کو اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا۔ وہ نہیں ہے تو یہ سب کتابے جان اور ان، غم زدہ محسوس
 ہوتا ہے۔

وہ آنکھیں بند کر کے کھڑکی کے پاس بیٹھا رہتا۔ امی کھانے کے لئے آواز دیتیں تو وہ ہرجھل

قدموں سے میز پر جانا۔ چپ چاپ روائے منہ میں رکھتا رہتا۔ ہاں پوچھتی، کیوں ریشا، غیر تو ہے نہ
 میں، وہ۔ ائی، ٹھیک ہوں، ٹھیک ہی تو ہوں۔

”کھانا اتنی بے دلی سے کیوں کھا رہے ہو! اچھا نہیں کیا۔ یہ دلی کی کچی، دھیان سے کھانا
 نہیں پکائی۔

”کھانا مزیدار ہے۔ وہ ائی۔ ذرا ایک دوست نے چالنے کے ساتھ کئی چیزیں کھلا دی
 تھیں:

ہاں سکرائے لگتی۔

”یہ تمہارا کیا دوست ہے دوزاتی سادی چیزیں کھلا دیتا ہے۔“

اس صبح وہ بنگ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے یاد آیا کہ آج اسے چنڈی میں ایک
 مینگ میں شامل ہونا تھا۔ وہاں گھنٹہ بنگ میں صرف کرنے کے بعد وہ دھین میں بیٹھ کر چنڈی
 روانہ ہو گیا۔

مینگ مقرہ وقت سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ وہ دفتر سے باہر آیا اور دھین کا انتظار کر رہا
 تھا کہ اچانک اس کا سانس تیز تر ہو جانے لگا۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک شخص دیکھ کر
 کو دھکیل رہا تھا کہ وہ ایک جوان عورت، بیٹی تھی۔

وہ مسلسل اس منظر کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ دونوں۔ کڑی اور اسے حرکت دینے
 وار۔ دونوں اصرافال کے جھوم میں غائب ہو گئے۔ اس کے اندر ایک گرم رد چل رہی تھی
 جس کی مدت بڑھتی جا رہی تھی۔۔۔ لہو بہ لہو برصہتی جا رہی تھی۔

اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب دھین آئی اور اس کے قریب چند منٹ تک کھائے کھو
 گئی۔ اور پھر وہ اچانک لاہور جانے والی دھین میں سوار ہو گیا۔

اس کی میٹھی موٹی روڈ کے ایک پرانے مکان کے دروازے پر رک گئی۔ کھال بیل پرانگی
 رکھ کر وہ دروازہ کھینے کا انتظار کرنے لگا۔

دردانہ کھل گیا اس کی نگرہی، رفیعہ کی نظروں سے نکلیں۔
 رفیعہ نے اس سے ایک لفظ تک نہ کہا اور دردانہ کے ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ اند
 گیا۔ رفیعہ اس کے آگے آگے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔

ڈرائیونگ روم میں پہنچ کر دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔
 ”آپ آگئے ہیں۔“ رفیعہ نے پہلی مرتبہ منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔
 ”فصیحہ۔“

”خیر مل سکتے۔“
 ”مجھے مذمت ہے رفیعہ۔ خط بھی مل گیا تھا۔ اس سے کہو:
 رفیعہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔
 ”وہ اگر دنیا میں ہوتی تو۔“

داؤد کو سانس اپنے سینے میں دکتا ہوا محسوس ہوا۔
 ”ہسپتال میں آپریشن ہوا۔ اور۔۔۔ وہ کمرے سے نکل گئی۔
 داؤد صوفے کے قریب کھڑا تھا۔ کمرے کی ہر چیز اس کے سامنے گھوم رہی تھی اسے
 رفیعہ کی آواز کسی دور دراز مقام سے آتی ہوئی محسوس ہوتی۔
 ”اس نے کہا تھا۔ جب بھی تم آؤ۔۔۔ یہ امانت تم کو دے دی جائے۔“
 داؤد نے سامنے دیکھا۔

رفیعہ چار درمیں بیٹی ہوئی کوئی شے بازوؤں میں سنبھالے کھڑی تھی
 ”اس نے کہا تھا۔ مجھے صاف کر دینا۔ میں آپ کو کچھ نہ دے سکتی۔“
 بچہ رونے لگا تھا۔ رفیعہ اسے اٹھانے اپنی جگہ پر کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔
 اندھولی طرزاں پر تابا پانے کی کوشش میں اس کے چہرے کی بکریاں ابھرتی تھیں۔ ڈیڑھ پھیل سے گئے تھے۔
 داؤد کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کس وقت وہ آگے بڑھا۔ کب اس نے اپنے بازو پھیلائے
 اور کب دوسرے ہونٹے لیے کماپنے سینے سے لگا لیا۔

علیا کی مٹی

وہ دن جمعرات کا تھا۔ رات کے پچھلے پہر ہی سے فضا میں بادل اٹھنے چلے آ رہے تھے اور لمحہ بہ لمحہ ان میں اضافہ ہو رہا تھا۔ صبح سے شام تک ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہا تھا کہ ابھی موسم لا دھارا بارش شروع ہو جائے گی اور جو لوگ گھروں سے باہر کام کاج میں مصروف ہیں ان کے لئے واپس آنا ایک مسئلہ بن جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ ناصر علی جتنی دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا رہتا رہا اور بے کیفی کے عالم میں بے وقت گزارتا رہا۔ وہ جب سے ریلوے کے ٹکٹے میں سینتیس برس مختلف عہدوں پر نائز رہ کر رہا تھا، وہ اپنے ہوا تھا، دن کے تین چار گھنٹے گزارنا اپنے پرانے اور نئے اجباب سے طمانت کرنے اور ادھر ادھر مگھوم پھر کر گزارنا تھا۔ ایک لمبی مدت تک گر خوار نفس بہنے کے بعد اسے آزادی ملی تھی اور وہ اس آزادی سے ہر امور اناٹا اٹھانا چاہتا تھا۔ اب اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہو سکتی تھی۔ بچے برس روز گزار تھے۔ کسی کا وجود بھی اس پر بوجھ نہیں تھا۔ بوی ذہین، سلیقہ مند اور متعل مزاج خاتون تھی جو ناگوار سے ناگوار احوال میں بھی خوش رہ سکتی تھی۔ اس نے وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بے نگرانی کی زندگی بسر کرنا تھا۔

اس روز وہ گھر سے باہر نہ نکل سکا تو اسے بڑی کوفت ہوئی وہ سمجھ چکا تھا کہ اب مزید انتظار کرنا فضول ہے اور وہ باہر جانے کی تیاری کرنے لگا کہ بارش ہونے لگی، اس حالت میں وہ کیسے کہیں جا سکتا تھا؟

بارش دو گھنٹے کے بعد ختم ہو گئی۔ جتنی لمبی رست واپس پر ایک نظر پھل ۱۰ بج چکے تھے۔ وہ گیارہ

سے ہینٹر پتنگ پر لیٹا نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ مطالعے کے بعد اس کی آنکھوں میں نیند آتی تھی۔ مگر ابھی سوہانے کی کوئی ٹھک نہیں تھی اس نے دیرین کوٹ پہنا، جھڑی ٹاٹھ میں لی اور اپنی بیوی کو اطلاع دے کر گھر کے دروازے سے نکل گیا۔

بادلوں کا جھوم فضا میں معلق تھا۔ ہوا سرد تھی اور سڑکوں بازاروں میں پندہ میں منٹ کے بعد انکا دکھا آدمی دکھائی دے جاتا تھا۔ دن بھر کی کوئت دور کرنے کا ایک مناسب ذریعہ اس نے ہی خیال کیا کہ چلتا چلا جائے اور جب تک خشک نہ جلے واپس نہ آئے۔

وے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں پہنچ گیا ہے، اچانک اس کے کان میں انجن کی سیٹی گونج اٹھی اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ شین کے قریب آ گیا ہے۔ تھوڑی دیر وہ سافرخانے میں پھرتا رہا۔ تھکاوٹ غموں کے ایک پچ پر بیٹھ گیا اور پھر واپس جانے لگا۔

اپنے گھر کے دروازے سے کچھ دور دک کر اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجے میں دن منٹ باقی تھے۔ دو گھنٹے گھومنا رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہ بات اس نے اپنے آپ سے اس مقصد کے زیر اثر کہی کہ اب وہ خشک گیا ہے تو اس میں حق بجانب ہے۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے کوٹ اتار کر کرسی کے بازوؤں پر پھیلا دیا۔ جھڑی کوٹے میں رکھی۔ شب خرابی کا لباس پہنے ہی والا تھا کہ کمرے کی کھڑکی میں سے ڈرائیونگ روم میں روشنی دکھائی دینے لگی۔

رات کے گیارہ بجے ڈرائیونگ روم میں روشنی آ اسے حیرت ہوئی۔ گھر میں اس کی بیوی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ رخصت ویرانہ بامدہنی خانے میں ہی مصروف رہتی تھی یا باورچی خانے کے باہر سٹائن وینو کا کام کرتی تھی۔ ڈرائیونگ روم میں نہیں جاتی تھی تو آج ڈرائیونگ روم میں روشنی کا مطلب کیا کوئی بہانہ آ گیا ہے یا کہیں گھر میں کسی کی طبیعت تو نہیں خراب ہو گئی ہے۔ اسی اثنا میں دروازے کا پردہ ہٹا کر دیکھ لی۔

ایک صاحب پورے ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ رحیم نے اسے بتایا۔

ممکن ہیں ؟ چشتی نے پرچھا۔

رضیہ اپنے شہر میر کے اکثر احباب کو جانتی تھی۔ ان کی بیویاں اس کی سہیلیاں تھیں۔ کوئی دوست آتا تھا تو وہ اس کا نام لے کر ہی آنے کی خبر ملتی تھی۔

چشتی نے یہی کو اس انداز سے دیکھا جیسے پرچھو رہا ہو کیا تم اسے نہیں جانتیں۔ رضیہ نے اس کی نظروں کا مہلوم سمجھ لیا۔ بولی : نہیں۔ میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا تھا۔

”کون ہے یہ شخص جو ایسے خراب موسم میں ایک گھنٹے سے اس کا منتظر ہے؟“ اس نے خود سے سوال کیا اور ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگا۔ چلو۔ دیکھتا ہوں : شہر میر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر رضیہ دردناک سے ہٹ گئی۔ اور اس شخص سے کھانے کی بیڑکے سامنے انگاری میں سے چائے کے برتن نکالنے لگی کہ شاید اب اسے یہاں کے لئے پہلے تیار کر لی جاوے گی۔

جب تک وہ برتن نکالنے چشتی ڈرائنگ روم کے کمانڈ جا چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کرسی پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہے۔ لباس بہت سادہ، سر اور دھڑکی کے بال بڑھے ہوئے چشتی کو گواہ آنے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

چشتی اپنی زانگ میں اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

”غزلیف رکھیے : اس نے ٹکنا کہا اور کرسی کے پہلو میں موئے پر بیٹھ گیا۔

”آپ آخر علی چشتی بریل کے گھر میں تآ؟“ اس فقرے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کہنے والا ان پڑھ ہے۔

”جی ہاں۔ فرمائیے اس وقت کیسے تکلیف دہ؟“

”ابھی نے ذرا غور سے چشتی کے چہرے کو دیکھا۔ اور بولا : ”ہسپتال میں ایک بیمار نے آپ کو بلایا ہے۔“

”ہسپتال میں ایک بیمار نے مجھے بلایا ہے۔ کون ہے وہ ؟“ چشتی نے پرچھا۔

”ابھی چند لمے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا : ”آپ خود دیکھ لیں گے۔“

جنتی کے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ اس کا کوئی دوست ٹریفک کے حادثے میں زخمی ہو گیا ہے یا ایسا حادثہ کسی عزیز کے ساتھ پیش آیا ہے بولا "مہربانی کر کے حلف کیجیے کون کون سا صاحب؟"

اجنبی نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔
جنتی کے ذہن میں ایک کشمکش سی برپا ہو گئی۔ اسے جانا چاہیے یا نہیں۔ اجنبی کے متعلق اس کے ذہن میں یہ تاثر بھی ابھرا کہ ممکن ہے کہ وہ کسی خاص منصوبے کے تحت اسے گھرے باہر لے جانا چاہتا ہو۔ اور یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ شاید کسی واقف کار کو جو اس وقت ہسپتال میں ہے، اس کی ضرورت پڑ گئی ہو اور اس نے اسے بلوایا ہو۔

اجنبی نے اس کے خیالات اس کے چہرے کے تاثرات سے بجانب ملے تھے۔ کہنے لگا۔
"جناب، اللہ جانتا ہے میں آپ کو دھوکا نہیں دے گا میں آپ کو دھوکا دے بھی کیسے سکتا ہوں۔
خدا کے لئے دیر نہ کیجئے۔ کیا پتا وہ"

جنتی نے دیکھا کہ یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز ٹھوگر ہو گئی ہے اور اس کے چہرے پر کرب اور دکھ کے گہرے سائے پڑنے لگے ہیں۔

ایک منٹ تک دونوں خاموش بیٹھے رہے جنتی کی کشمکش دوسرے ذہن میں اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا اگر بیوی سے اس مسئلے میں مشورہ طلب کر سکے تو وہ اسے ہرگز جانے نہیں دے گی۔ آدھی رات کو ایک اجنبی کے کہنے پر اس کے ساتھ گھر سے نکل جانا وہ کسی صورت میں مناسب نہیں سمجھے گی مگر اس کا دل کہتا تھا یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔

"چلتے صاحب! سہزادہ تھا کہ آپ مجھے صبح بات بتا دیتے اس صورت میں ہرگز
اجنبی نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے ماتھے میں لے لیا۔ اللہ جانتا ہے ایک بیلادی نے آپ
کر لیا ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے۔"

جنتی ڈرائیونگ روٹ سے باہر نکلا۔ کچن کی لاٹ آف ہو چکی تھی۔ دہلیہ خراب گاہ میں

جلی گئی تھی کیونکہ جشتی نے اسے چالنے والے سے ٹک دیا تھا اس نے کوٹھی کے بجلی بجے ہیں جاکر راجو کو جگایا اور اسے ہسپتال چلنے کے لئے کہا۔

راجو نے ہوجھا کیوں صاحب جی! خبر تو ہے۔

”خیر یہ راجو میاں! خیر ہے۔ لڑکی کوئی بات نہیں۔ خود جا چلو۔“

ابنہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جشتی پچھلی سیٹ پر۔ راجو کی بیوی نے کوٹھی کا مین گیٹ بند کر لیا۔ گاڑی اشارت ہوئی تو بونڈا پاندی سو رہی تھی اور جب وہ کچھ لگے بڑھی تو ابھی خامی بارش ہوئے گی۔ چندہ سول منٹ بعد گاڑی ہسپتال کے اندر داخل ہو گئی۔ گاڑی میں سے پہلے ابنہی اترتا پھر جشتی! ہر آٹا ڈرائیور باہر نکل کر گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اب کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا مگر وہ کہ جشتی کے ذہن میں یہ خیال ابھرتا تھا کہ آخر یہ معاف کیا ہے کسی شخص نے اسے اپنے پاس بلا لیا ہے!

ابنہی آگے آگے چلا جا رہا تھا اور جشتی پیچھے پیچھے وہ یہو ہسپتال کی سڑک کوٹ داروڑ بھی جس کے اندر ابنہی جشتی کو لے گیا تھا۔ ایک بیڈ کے قریب پہنچ کر ابنہی کے قدم رک گئے اس بیڈ پر ایک بوڑھا شخص بٹا تھا۔ سخت بخت و زور بڈیوں کا ڈھانچہ اس آدمی کو بھی اس نے پہنے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”جشتی صاحب! اسے پہچانتے ہیں؟“

جشتی ہلکی باز سے اس ابنہی کو دیکھنے لگا۔ مریض نے بیٹھے کی سہی اکام کی اس کا سر نیچے سے ڈرا اوپر ہوا اور پھر گر پڑا۔ غوطہ کھاست سے اس کا چہرہ بالکل بے جان نظر آ رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟ جشتی کے ذہن سے اس کی اپنی آواز نکلاں۔۔۔“ آخر یہ کون ہے؟ آواز دوسری مرتبہ نکلاں۔ مریض کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور پہلا ابنہی اس کے سر کے نیچے ٹکیہ درست کر رہا تھا۔ جب سالانہ مریض جشتی کے سامنے ابھرا تو اپنے پیچھے ایک سہمی ایک بیڈ پر لیٹی تھی حقیقت کا نقش بھی چھوڑ گیا۔ ان لوگوں کو مزور غلط سمجھا جاتی ہے یہ ابنہی غلط آدمی کو لے آیا

ہے۔ میرا اس مریض سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میں نے اس سے پیشتر اپنی پوری زندگی میں اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔

مریض کے چہرے پر ایک کھنچاؤ سا آگیا تھا، شاید اس وجہ سے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہ نہیں لکھا تھا۔ پہلے انہی نے تجھے درست کر لیا تھا اور اب وہ جیسی کہ اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہر چہرہ پر ہو، کیوں آپ نے اسے پہچان لیا ہے؟ جیسی بدستور جیون و پریشان کھڑا تھا۔ اچانک سن کی سی آواز آئی اور جیسی نے دیکھا کہ انہی نے مریض کے تجھے کے پاس بڑی ہلنی ایک ٹی کو اٹھا یا اور اسے ٹیبل کے اوپر رکھ دیا۔ ہسپتال میں ایسی ٹیبل مریض کو اپنی چیزیں رکھنے کے لئے ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے دی جاتی ہے۔

سن سن سن جیسی کے کانوں میں ٹی کی آواز مسلسل گونجنے لگی اور مریض کے کھمبے ہرے نفرتوں ایک دوسرے سے بیوست ہو کر ایک چہرے کے ضد خال میں منتقل ہونے لگے۔ وہ ہسپتال کے ماحول سے دور ہونے لگے۔ دور ہوتا چلا گیا اور ایک منظر اس کی نگاہوں تلے پھرنے لگا۔

ایک دہریہ چلچلاتی ہوئی دھوپ جیسی کی روزن ذرا تحلیل تھا۔ دفتر نہیں جاسکا تھا۔ چھت کا پنکھا غل پیسٹ پر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے میں نیچے سرکاک پرا دھیرہ عرصہ کا ایک شخص ڈھول بجانے والے کے ساتھ ٹی بجایا، ہرگز نہ لگا۔ وہ کسی نرم کے سینہ اور اذناں آٹے کا اعلان کر رہا تھا۔ ٹی والے نے جیسی کو دیکھا تو ڈک کر ٹی بائیں ہاتھ میں لے کر دائیں ہاتھ کی تنجیل ہرنٹوں سے لگانے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ پانی مانگ رہا ہے۔

جیسی خود اٹھ اٹھ نیچے آیا اور ٹی والے کے ساتھ ڈھول بجانے کو بھی ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ دونوں کو دو دو گلاس شربت کے دیئے۔ اور وہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد عکبرہ ادا کر کے پلے گئے۔

کیا یہ وہی ٹی والا ہے؟ ایسا دیکھا ہے۔

اجنبی نے تیسری مرتبہ اسے استفسار طلب نظروں سے دیکھا تو جنتی میں ایک ایسی تبدیلی آگئی کہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا تو کیا اسے پہچان چکا ہے؟ کب سے یہ حالت ہے؟ جنتی نے پوچھا۔

اجنبی نے اپنے وارنڈم تھوکی پانچوں انگلیوں کو لہرا دیا، اس کا مطلب پانچ ماہ بھی ہو سکتا تھا اور پانچ دن بھی۔ مریض نے آنکھیں کھول دی تھیں، اس نے سر کو ذرا جنبش دی۔ اجنبی نے تھک کر اپنا دایاں کان اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔ مریض کی گواہی بہت خف اور کمزور تھی۔ جنتی کو کچھ بھی سنائی نہ دیا۔

اب اجنبی نے اپنا کان مریض کے ہونٹوں سے ہٹا دیا اور بولا: "علیہ کس ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔ یہ نفی میری مدح ہے۔ میں اسے کسی کو نہیں دے سکتا۔ یہ مجھے بہت ہی ہمدردی ہے۔ یہ میری مثال ہے آپ کو دیتا ہوں۔ مریض نے نفی پر ہاتھ دکھ دیا۔ پھر اسے ذرا اوپر اٹھایا۔

"سے نو باز؟" اجنبی نے کہا۔ جنتی نے نفی اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔

"پلاس کا کوئی دبیاریٹی؟"

مریض نے جنتی کو کچھ کہتے ہوئے پایا تو اجنبی کو انگلی کے اشارے سے قریب بلایا۔

"باز کتبے علیہ کا اپنا کوئی بیٹا۔" اجنبی نے ذرا لبک کر کہا۔

مریض نے تو کچھ نہ کہا، اجنبی لولا، دینا میں صرف ایک بیٹا ہے۔

مریض کی آنکھوں سے آؤٹ کل وٹے۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔

"چلو ہاؤ۔" علیہ کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ اور اجنبی جنتی کو گاڑی کے پاس چھوڑ کر واپس اپنے مریض کی طرف چلے لگا۔

گاڑی کب ٹائٹ ہوئی، کس رفتار سے چلی، کن راہوں سے گاڑی جنتی ان باتوں سے

بے خبر ہو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا نفی اس کے پہلو میں پڑی تھی اور وہ ابھی تک اپنی

آنکھوں کے سامنے اس کمزور ضعیف اور بے بس سر میں کو دیکھ رہا تھا جس نے اسے یہ ملی دی تھی۔ کیا وہ اسے اپنے کسی وارث کے سپرد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اپنا ایک بیٹا بھی نہ ہے جس کے ذکر پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ کیا وہ بیٹا کہیں بہت دور چلا گیا ہے۔ جہاں سے وہ اپنے مرنے ہوئے باپ کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لئے نہیں آ سکتا۔ بیٹا نہ ہی کوئی اور رشتہ دار ضرور ہو گا۔ میں نے اس کی پیاس بجھائی تھی یہ بہت معمولی شے ہے۔ اس نیکی کا بدلہ اس نے مجھے یہ دیکھ کر اپنی نفی جہاں سے بہت عزیز ہو گئی میرے سپرد کر دی ہے۔ میں اسے کیا کر سکتا تھا۔ میرے لئے تو یہ ایک بے کار سی شے ہے، کہاں دیکھوں گا اسے؟

گھڑی کوٹھی کے دروازے پر رک گئی تھی۔ ایک منٹ گزر گیا تھا اور گاڑی کا پچھلا گیٹ نہیں کھلا تھا چشتی ان خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ خود دروازہ کھول کر باہر نکلتا تھا مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی تھی۔ راجہ نے باہر نکل کر گیٹ کھولا اس وقت چشتی کو صورت حال کا علم ہوا۔ اس نے نفی پکڑی اور باہر آ گیا۔

راجہ نے نفی کو پہلی مرید دیکھا تھا۔ حباب جی! یہ کیا ہے؟

کچھ نہیں۔ دروازہ کھلاؤ۔

راجہ نے کال میل پر انگلی رکھ دی۔ اس کی بیوی جو غائبہ جاگ رہی تھی، اس نے آکر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ خواب گاہ میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ رضیہ کو اس ساری کاسبتانی کا کوئی علم نہیں ہو سکا تھا چشتی نے نفی ڈرائنگ روم کی چٹائی پر رکھ دی۔ لائٹ آف کی اور چاہا کہ خواب گاہ میں چلا جائے مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے پاؤں دروازے کی طرف اٹھتے ہی نہیں تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر حلیا اس کے سامنے آ گیا اور ایک بار پھر وہی سوال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ . . . حلیا نے اپنی نفی اس کے حوالے کیوں کی ہے؟

وہ قریب قریب ایک گھنٹے تک جاگتا رہا۔ آخر ضرورگی ایک عبادت کی صورت میں اس کی آنکھوں میں اترا آئی اور وہ وہیں سو گیا۔ اور اس وقت یہاں ہوا جب اس کی بیوی اس کے

اور ہر جگہ ہونی حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”رات آپ بستر پر نہیں لیٹے؟ رضیہ کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ یہ بنگ کی باغیچہ پر چادر ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ اس کا شوہر سوتے وقت چادر اپنے اوپر ڈال لیتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ چشتی نے اسے ساری رات دوا دینا شروع کیا۔

”یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ وہ بولی۔

”میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔۔۔ ہر حال وہ نئی بیوی ہے۔“

رضیہ نے نفی کو طور سے دیکھا۔ یہ ضرور اسے بہت پیاری ہوگی۔ یہ کیسی کبھی رائیگاں نہیں جاتی:

”تم کہنا یہ چاہتی ہو کہ اس نے نفی دے کر اس کی کالہ چھایا ہے؟ چشتی نے سوال کیا۔

”وہ اور کیا دے سکتا تھا؟“

رضیہ نے چند سیکنڈ کے لیے نفی کو اٹھایا اور پھر اسے رہیں دیکھ دیا۔

”آج جمعہ ہے۔ رات آپ ٹھیک طرح سوئیں گے۔ ناشتہ کر کے سو جائیں۔ یہ کہہ کر رضیہ

ٹوڈینگ روم سے نکل گئی۔

ساڑھے نو بجے تھے جب چشتی ناشتہ کر کے، اخبار پڑھ کر اور تین غزوی خط لکھنے کے بعد دروازہ

باز کر رہا تھا تو بیوی کے وہ خواب گاہ میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹ بھی گیا لیکن اس وقت سوناوہ

پہنڈ نہیں کرنا تھا۔ اچانک اسے غیظ کا خیال آ گیا۔

”اب اس کی کیا حالت ہوگی۔۔۔ مجھے ہسپتال جانا چاہیئے۔“

اس کے ذہن میں ایک غلطی سی ہوئے لگی، اس نے ایک جاں بلب مریض کو دیکھا تھا وہ اس

سے کیسے بے نیازہ سکنا تھا۔ رضیہ سے راجہ کے متعلق عداوت کی تو پتا چلا کہ وہ کسی کام کے لیے

باز رہ گیا ہے۔ محمودی ویرنگ آجائے گا۔ چشتی مہن میں آگیا۔ تودہ گفتہ گور گیا اور راجہ کو آبا چشتی

”کے باہر آیا کہ کٹھن لے کر چلا جائے کہ رات والا اجنبی اسے قریب سے اپنی طرف آتا ہوا

دکھائی دیا۔

”باذبی! علیہ نے آپ کو سلام کہا تھا۔ اجنبی نے قریب آکر کرناک لپٹے میں کہا۔
چشتی نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سنبھلی ہوئی تھیں۔ چہرہ ویران اور انصرہ تھا۔ گھٹوں
پر جا بجا دھنسنے سے پڑے تھے۔

”آپ پہلے آئے تو تھوڑی دیر بعد اس کی حالت خراب ہونے لگی اور جب صبح کے چھ بجے
ہوں گے کروہ۔۔۔“

”مر گیا! چشتی نے بھرتل ہونے آواز میں پوچھا۔

”جی ہاں۔ باذبی۔۔۔“

”بہت انوس ہوا چشتی نے یہ الفاظ کہہ کر ایسے اذاز سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ پھر کیا ہوا
”باذبی علیہ کے بہت سارے دوست ہیں۔ میں نے ایک آدمی کے گھر جا کر اسے بتا دیا اور
واپس آگیا ایک گھنٹے کے اندر تیرہ چودہ لوگ آگئے اہ علیہ کو بیانی صاحب میں دفن دیا۔
باذبی علیہ نے مدکم پورے پچاس برس تک ”نی بھائی“ تھی۔ ہر دنگل میں ہر جگہ میں اور ہر سیلے میں
وہی ”نی“ بجاتا تھا۔ فرسوں اور کارخانوں کے مالک اپنی چیزوں کی شہودی کرانے کے لئے اسی کو بلواتے
تھے۔ باذبی علیہ بڑا دلنصیب تھا بے چارہ ریوی جولانی میں مر گیا۔ اس نے دوسرا بیاد نکیا کو سرتی
ہاں اس کے ورثے سے اچھا سلوک نہیں کرے گی، پرانڈ کو فک کہہ اور ہی منظور تھا باذبی! علیہ کا
ریشا منظور بڑی صحبت سے خراب ہو گیا۔ اس کا بڑا دکھ تھا علیہ کو۔ وہ نشہ پانی کرتا ہے، بیکوں میں
پڑا رہتا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے سب کچھ ہی اگل دیا تھا۔

”تم اس کے دوست تھے؟ چشتی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میرا منگولیا یا تھا جی۔ اگر اس سے پوچھا جاتا کہ سب سے اچھا دوست کون ہے تو

وہ ضرور کہتا ابراہیم آ

”تم ابراہیم ہو؟“

”جی ہاں“

”ابراہیم ایک بات بتاؤ۔ تم کہتے ہو تم علیہ کے لنگڑیا دار تھے۔“

”جیسا کہتا ہوں باؤجی؟ ابراہیم جلتے اپنی سے بولتا۔“

”میں اسے کچھ ہی مانتا ہوں۔ مگر میں ایک بات نہیں سمجھ سکا کہ یہی تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم سب کو چھوڑ کر علیہ نے کئی کچھ کیوں دی؟“

ابراہیم کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ یہ سوال سن کر وہ مضطرب ہو گیا ہے۔

”اللہ جانے باؤ۔ یہ بات میں بھی نہیں سمجھ سکا کہ کنی دفعہ اس نے تمہارا ذکر بڑے پیار سے کیا تھا۔ کہتا تھا جنتی صاحب نے شریعت پلایا تھا تو میری جان میں جان آئی تھی۔ تمہارا بڑا احسان ایتنا تھا باؤ جی اور کوئی بات نہیں تھی۔“

ابراہیم کچھ دیر اور بیٹھا رہا وہ علیہ کی باتیں کرتا رہا۔ پھر جانے لگا۔

”اچھا باؤ جی۔ اللہ تمہارا سہارا کرے۔ علیہ کے لئے دعا مانگ دیا کریں۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔“

باؤجی:

”کہاں جاؤ گے؟“

”میں علیہ کے لئے کچھ جی سے آیا تھا باؤ جی۔ دلوں میرے دونوں طرف کے رہتے ہیں۔ اچھا کا دوبارہ“

”ہے ان کا۔ ان کے پاس رہتا ہوں۔“

ابراہیم چلا گیا۔

اس دفعہ یہاں آئے جنتی بزرگانی کے غرض میں مہتمک ہو گیا۔ لیکن وہ سوال ابراہیم کے ذہن میں کھینکے لگتا تھا کہ علیہ نے اپنی کئی اس کے چہرہ کیوں کی تھی جب یہاں شخصت ہو گئے اور صرف خلائق وہ گئیں جنہوں نے رضیہ کو گھیر رکھا تھا۔ جنتی ناراض تھا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سات کے وہی بیچ چکے تھے وہ دو روز پرانے اخبار کے صفحات پر برہمہری نظر ڈالنے لگا۔ ایک خبر پر اس کی نگاہ رک گئی۔ لکھا تھا: علیہ کی والدہ جس نے نصف صدی تک کئی بجا کر بے شمار دنگلوں، مرسوں اور میلوں کی رونق بڑھائی تھی۔ رات طویل علالت کے بعد فوت ہو گیا۔ ایک

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سنا جا رہا ہے اس نے اپنی زندگی بھر کی رفیقہ فی اپنے بیٹے یا کسی دوست کو نہیں دی تھی کسی خاص شخص کو بلکہ اس کے حوالے کی تھی جو درس ڈیوٹی پر تھی اس نے ہمارے ناندے کو بتایا کہ میں نے اس شخص کو دیکھا ضرور ہے جسے علیا نے اپنی فی دی تھی مگر اسے بالکل نہیں جانتی:

اس نے اخبار جمعہ کے میز پر پھینک دیا: یہ اخبار دوسرے بھی عجیب ہوتے ہیں، ہر طرف کو خواہ مخواہ حسن خیر باریتے ہیں: وہ اپنے کمرے سے نکل کر خواب گاہ کی طرف جانے لگا کہ ٹن ٹن ٹن کی آواز آئے گی۔

”یہ فی کون بجا رہی ہے؟ اور وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ گیا۔
چند خواتین وہ گئی تھیں جن کی گھاڑیاں انہیں لے جانے کے لئے ابھی تک پہنچی نہیں تھیں۔
اس نے دیکھا کہ فی اس کے ماموں کی بیٹی کے ہاتھ میں ہے۔
”بھائی جان! آپ تو جواب نہیں دے سکیں۔ آپ بتائیں گے؟“ اس نے پوچھا
”کیا بتاؤں؟“

”بھائی جان! علیا نے اپنی فی آپ کو کیوں دی ہے؟ کیا آپ اس کے دوست رہ چکے ہیں؟“
”نہیں۔ میں کبھی اس کا دوست نہیں رہا تھا۔“
”پھر اپنی فی اس نے مرتے وقت آپ کو کیوں دی؟“ وہ نے سوال کیا۔
”کیا بتاؤں۔ میں نے اس کے ساتھ ایک بہت معمولی قسم کی ہمدردی کی تھی، بھلا کسی پر اسے کربانی دانی پلانا بھی کوئی بڑا احسان ہوتا ہے، اس نے اسے بڑا احسان سمجھ لیا۔“
”اچھا!“

”... تو اور کیا؟“

باہر سے لڑائی کی آواز آئی اور خواتین اپنے مہلوں پر دوپٹے دوست کو کے بھاگنے لگیں چلتی
نے فی کو ٹھہرا اور اسے ایسے کمرے کی طرف دیکھ دیا۔

صبح بیٹھنے کے بعد وہ اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک عنوان پر پڑی۔ عنوان تھا۔
 علیانی والا اور ابتدائی سفر تھی۔ اب وہ آواز بیٹھ کے لئے خاموش ہو گئی ہے جو گذشتہ نصف
 صدی سے گونجتی رہی تھی۔

چشتی کی آنکھوں میں سکراہٹ تیرنے لگی تھی۔ اپنی بیوی کو آواز دی: رضیہ! رضیہ!...!!
 رضیہ جو باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی اس پر کی آواز سن کر تیزی سے
 آگئی۔ کیلپے.....؟

”رضیہ! ایک عجیب معاملہ ہو گیا ہے۔ میں تو اب سمجھا ہوں کہ علیانی والا ایک بڑا آدمی تھا۔
 دیکھو اس پر پورا پھر چلے، دیکھو تو...: اور یہ کہتے ہوئے چشتی نے اخبار بیوی کے ہاتھ میں
 دے دیا۔ رضیہ اخبار دیکھنے لگی۔

”ارے؟“

”کیا ہوا؟ چشتی کے منہ سے نکلا۔

”آپ نے فجر کا یہ حصہ نہیں دیکھا؟ اور وہ پڑھنے لگی؟ یہ بات ابھی تک ایک منہ ہے کہ
 علیانے اپنی عمر بھر کی رشتہ کی کس کے حوالے کی تھی؟ ہسپتال میں وہ کون انہیں آیا تھا جو اس
 سے ٹکے کر چلا گیا تھا؟ حالانکہ علیا کا اپنا بیٹا بھی ہے اور اس کے احباب بھی بہت بڑی
 تعداد میں موجود ہیں۔ امیو ہے جنسنگ یہ معاملہ ہو جائے گا۔ ہمارا نامہ نکلا یہ متاثر کرنے میں
 بڑی کمک و دھرم ہے۔ رضیہ نے اخبار کے صفحے سے نظریں ہٹائیں۔ چشتی کی آنکھوں سے
 حیرت و استعجاب کی سکراہٹ غائب ہو گئی۔

”میں کہتا ہوں ان اخبار دانوں کو ایسا موقع خدا دے گا۔

”لیکن آپ کیوں ٹھکر کرتے ہیں۔ کرنے دیں ان لوگوں کو جگ و دو۔ جب مسئلہ حل ہو گا تو
 رضیہ ہنسنے لگی۔ کھو دا پہاڑ اور نکلی ہمریٹا اور وہ بھی۔“

”یہ تو ہو گا ہی؟ چشتی نے مسکرا کر بیوی کی بات کی تائید کی۔

ساڑھے سات بجے وہ اپنے دوست رحمت خاں کے گھر کے دروازے پر کال بیل پر انگلی دے کر کھڑا تھا۔

”آئیے جتنی صاحبِ اثر رحمت نے کسی تھمر حیرت کے عالم میں اس کا خیر مقدم کیا کیونکہ جتنی اس سے پہلے کبھی اتنے سیرے اس کے ہاں نہیں آیا تھا۔ اندر آ جلیے! رحمت اسے کمرے میں لے گیا: ناشتہ تو ضرور کریں گے تا رحمت نے ٹکھٹا پر چھا۔

”نہیں خیر صاحبِ ناشتہ کر کے آیا ہوں کوئی نئی تازہ خبر!“

”اخبار دیکھا ہے۔ میں الانوای قسم کی تو کوئی خاص خبر نہیں؟“

”اور اپنے ملک کی خبر! — وہ پیچھے —“

یہ لفظ سن کر رحمت خاں ہنس پڑا، دیکھا ہے۔ لکھنے والے نے قتل لے جانے والے واقعے کو ایک سنا بنا دیا ہے؟

”دیکھ لیں چاراکال!“

رحمت خاں جتنی کے اس فقرے پر بھونپکا سا ہو گیا: اس میں آپ کا کال کیل ہے؟ وہ قتل اس خاکسار بھی کو قوی گئی تھی!“

رحمت خاں کو بہت حیرت ہوئی اور جتنی اس کی اس حیرت پر مسکولے لگا۔

”مگر جتنی صاحب آپ کا عطیہ کیا واسطہ؟“

بظاہر کوئی واسطہ نہیں میں کہاں، وہ کہاں، بس ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا تھا کئی سال پہلے۔ اور جتنی کے اسے پوری دودار ستادی۔

”اسے کہتے ہیں رانی کا پھانڈ بنانا۔ رحمت خاں نے کہا: اور ہاں ایک مشورہ بھی ہے؟ مشورہ کیا ہے رحمت خاں؟“

”مشورہ صرف یہ ہے کہ ایسی بات کسی کو بتائیے نہیں، دیکھتے ہوتا کیل ہے؟“ رحمت خاں نے

سرگوشی کی، وہ رحمت خاں کے ہاں آدھ گھنٹہ بیٹھا اور اس دستان میں عیاں قی رائے کے علاوہ

اور کسی موضوع پر بہت کم گفتگو ہوئی اور جس وقت وہ اپنے گھر کی طرف چلا تو گھرنندی کا وہ ایک سایہ سا جو اس کے ذہن پر محیط ہو گیا تھا اب دور ہو چکا تھا۔

دوسرے روز چشتی نے اخبار ایک ترقیع کے ساتھ اٹھایا۔ اس میں علیا ثقی دلا کے مطلق کوئی خبر کوئی اطلاع نہیں تھی۔ پانچ روز بیت گئے۔ چشتی وقت گزردی کے لئے جاسکی ناول کے مطالعے میں مصروف تھا کہ کال بیل بجی اور دو تین منٹ بعد راجو نے آکر بتایا تھا اب ایک آدمی آیا ہے؟

”کون آدمی؟“

”پتا نہیں جی کون ہے؟“

”اچھا۔ بٹھاؤ اسے آتا ہوں۔“

چشتی نے ناول بند کر کے یزید رکھ دیا اور دھیرے دھیرے ڈرائنگ روم کی طرف چلا۔ ایک صاحب جن کی عمر تیس بیسیس برس ہوگی کوچ پر بیٹھے تھے۔ چشتی کو دیکھ کر تنہا گھٹنے جو گئے۔

”تشریف رکھئے جناب۔“ وہ صاحب بٹھ گئے۔ بیگ کھول کر انہوں نے اپنا ڈرائنگ کارڈ نکالا اور چشتی کے سامنے رکھ دیا۔ چشتی نے پڑھا۔ یہ ایک معروف روزنامے کے نمائندہ تصویقی تھے۔ ”میں مسافری کا خواستگار ہوں۔ زحمت دے دے کہ ہوں یہ تمام زیر عمل انصاری ہے جیسا کہ آپ نے کارڈ میں ملاحظہ فرمایا ہو گا۔“

”جی ہاں آپ نے تعلق ہو چکا ہے۔ فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

انصاری نے اپنا بیل کھولا۔ اس میں سے اخبار نکلا۔ اس میں ایک ٹیچر چھپا تھا۔

علیا ثقی دالا کے بارے میں — لوگوں نے بہت پسند کیا ہے۔ اخبار کے سارے پورے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے ہیں۔ انصاری یہ لفظ کہہ کر اپنے فقرے کے رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔

”بہت خوب؟ چشتی نے کہا۔ انصاری کی آنکھیں چلنے لگیں۔

چشتی صاحب ایہ نہ پرچھے آپ کی تلاش میں کیسے کیسے ہفت خواں ملے کر نئے پڑے۔
ہسپتال والوں نے تو کورا جواب دے دیا کہ ہمیں اس آدمی کا کوئی علم نہیں جسے علیا نے ٹلی دی
تھی مگر جناب یہ اخبار ملے بھی بڑی جلد ہوتے ہیں۔

”اس میں کیا شک ہے؟ انصاری صاحب کی آنکھوں کی چمک دگنی ہو گئی۔

”دیکھ لیجئے آپ کے دل پہ کچھ کیا۔ کس طرح پہنچا یہ ایک الگ رو دا ہے بہر حال۔۔۔“

”جی۔ دیکھ لیا ہے۔ آپ کو میرا بتا کس نے بتایا؟“ چشتی نے پوچھا۔

”صاف کیجئے یہ راز کی باتیں ہیں!۔۔۔ کہی نہیں جاسکتیں۔ نامہ نگار نے سکوڑتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے آپ کو رحمت خواں نے بتایا ہے۔“

”ممکن ہے یہ بات درست ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ درست نہ ہو۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔ جس اطلاع کو مانتی ہو مل گئی۔ آج اس مسئلے میں انڈولیو کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ نامہ نگار
درا شہر پھر لولا۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ علیا سے آپ کے تعلقات کیسے تھے؟“ چشتی نے دروازے کی طرف

منہ کر کے ذرا بلند آواز سے ”چلتے بھجھکے“ کہا اور اخبار کے نامہ نگار سے مخاطب ہو کر بولا۔

”صاحب، تعلقات کیسے تھے اور کیسے تھے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ علیا کے ساتھ

میرے تعلقات تھے ہی نہیں؟“

”تعلقات نہیں تھے۔۔۔ تو پھر۔۔۔“

”آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس نے مجھے ہسپتال میں بلا کر اپنی ٹلی کیوں دی؟“

”جی ہاں؟“

”بس دے دی۔ اس کا جی چاہا دے دی۔ آپ کو یا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ چشتی

نے اپنی طرف سے خوشگوار مڑکا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”جی اعتراض کیا ہو سکتا ہے لیکن آپ کو جو خرچ دی تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی؟“

”ہوگی مغرور ہوگی صاحب“

نامہ نگار نے پہلی سرحد اپنی لوٹ بک پر کچھ لکھا چشتی نے اسے لکھیوں سے یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور اس کا کوئی فزٹس نہ لیا۔

”ایک اور سوال ہے چشتی صاحب؟“

”انشاء“

”آپ کے نزدیک اس تاریخی ٹی کا معنی کیا ہے میری مراد ہے آپ اس کا کیا کریں گے؟“

چشتی کو اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ اس پہلو پر تو غور کرنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔

”آپ کہتے ہیں یہ تاریخی ٹی ہے...؟“ چشتی نے اپنا فقرہ ابھی مکمل نہیں کیا تھا کہ نامہ نگار

جھٹ بول اٹھا۔

”تاریخی ٹی نہیں تو اور کیا ہے پچاس برس تک اس نے اپنے ملک کا ساتھ دیا ہے سنا گیا

ہے کہ علیا اسے جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔“

”انصاری صاحب؟“

”فریاد بندہ پرور؟“

”فرض کیا یہ ٹی آپ کو مل جاتی تو — چشتی نے اپنی طرف سے نامہ نگار کو آنا فٹس میں

ڈال دیا تھا۔“

انصاری نے دو چار لمحے غور کرنے کے بعد جواب دیا: ”آپ پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں کیا کرتا

میں اسے نوادر میں شامل کرتا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ شہر میں کئی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گھروں

میں نوادر جمع کر رکھے ہیں۔ کبھی کبھی ان نوادر کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔ شائقین دور دور سے آکر

انہیں دیکھتے ہیں۔ اخباروں میں ان کے بارے میں مضامین لکھے جاتے ہیں۔ بڑی شہرت ہوتی

ہے ان کی؟“

”مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ چشتی نے بلا تکلف اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا۔“

راجہ چلے لے آیا اور بڑے خوشگوار ماحول میں چائے پی جانے لگی۔

نامہ نگار کے جانے کے بعد چشتی نے نامہ نگار سے اپنی ملاقات کی دوداد ہنس ہنس کے اپنی بیوی کو بتادی مگر رفیعہ ہنسی میں اس کا ساتھ دے سکی۔

شام کے سات بجے ہوں گے۔ چشتی اپنی بیوی کے ساتھ ٹیلیوژن دیکھ رہا تھا اور راجہ کی بیوی جو باورچی خانے میں بہن قرینے سے اماری میں رکھ رہی تھی، اس کے کمال پیل سن لی۔ بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا کہ دو شخص کھڑے ہیں۔

”چشتی صاحب تشریف دکتے ہیں، ایک نے پوچھا۔

”دیکھ کر بتاتی ہوں: اور ٹرانسنگ روم میں آکر اس نے ان دو آدمیوں کے آنے کی اطلاع

دی۔

”بلا لاؤ، چشتی نے کہا۔

رفیعہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چشتی نے ٹیلیوژن بند کر دیا۔ چمنٹ بعد وہ آگئے۔

”سلام علیکم چشتی صاحب! دونوں نے ایک ساتھ سلام کیا۔

چشتی نے انہیں دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ بھی کس اخبار ہی کی طرف سے آئے ہیں۔ ایک کے دائیں شانے پر بکبرہ لٹک رہا تھا۔

”فرمائیے کیا حکم ہے؟ چشتی نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”شکریہ۔ ہم اپنا تعارف کرا دیں، ہم اخبار شش جہت کی طرف سے آئے ہیں، آپ کو ایک

نعت دینا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے پر ایک نقاب پڑی ہے، جس توقع ہے کہ آپ یہ نقاب

سنبھالیں گے یعنی ہمیں صحیح بتا دیں گے کہ فی کا واقعہ کیسے ہے۔ کیوں علیا لے...؟

چشتی کو ذرا غصہ آگیا: اگر آپ اسے ایک راز سمجھتے ہیں تو راز ہی رہے میں سادہ کچھ فرمائیے۔

چشتی کے یہ الفاظ سن کر دونوں نامہ نگاروں نے ایک دوسرے کو سنی خیر نظروں سے دیکھنے لگے۔

”چشتی صاحب! اگر لوگوں کو حقیقت حال کا علم نہیں ہو گا تو وہ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔

ایک بولا۔

”بٹلے دیجئے۔ چشتی کا غصہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”آپ کی مرضی۔ ہم آپ کو مجبور نہیں کر سکتے۔ کیا وہ مشہور معروف ملی دکھا سکتے ہیں؟ دوسرے نے کہا۔

چشتی اٹھ بیٹھا۔ دو منٹ بعد واپس آیا تو مٹی اس کے ماتھ میں تھی۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ اچانک فضا میں روشنی کی ایک جھلک سی ہوئی اور ایک سیکنڈ میں غائب ہو گئی۔

”ہیں شکر یہ چشتی صاحب! اوورز مونسے سے اٹھ بیٹھے

چلے آ رہی ہے؟ چشتی نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

”پھر کبھی بھی! وہ دونوں چلے گئے اور چشتی بھی اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اس کا موڑ

خراب ہو گیا تھا اور اس وقت نئی کے باڑے میں ایک لمبے کے لئے بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا،

کمرے میں جا کر آرام کریں۔ دھن گیا۔ وہ جب سے مرثاڑ ہوا تھا، پندرہ میں روز کے بعد اپنے

ٹھکے میں چلا جاتا تھا۔ اس کے کچھ وہ پرانے مدنی جن کی دو دو تین تین سال سے ملازمت جاتی

وہ گئی تھی بڑی محبت سے اس کا غیر متقدم کرتے تھے اور چشتی دیر تک ان کے ساتھ مختلف ہوتے

پر باتیں کرتا رہتا تھا۔ دوستوں کی صحبت میں گزری ہوئی یہ گھڑیاں اسے بہت عزیز تھیں۔ انتخابی

نمائندوں سے ملاقات کرنے کے سرے روز بعد وہ اپنے ٹھکے میں جا رہا تھا۔ اس کا بہانا دوست

ارشاد کمرے کے باہر ہی لی گیا۔ ارشاد کی ملازمت بھی ختم ہو گئی تھی۔ مگر اسے ایک برس کی

توسیع مل چکی تھی۔ چشتی کالے ٹکٹ دوست تھا اسے دیکھتے ہی بولا: ”تیرے نئی والے چشتی صاحب!

چشتی نے ارشاد کی کسی بے تکلفی کا بڑا انہیں مانا تھا مگر اس کے یہ الفاظ اسے بڑے لگے اور خطاب

ممول اس نے تلخ لہجے میں پوچھا: ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ چشتی کے لہجے میں مدنی تھی لیکن

ارشاد نے اسے غصوں دکایا۔

”مطلب! کیا ہو سکتا ہے اس کا ایک تھا وہ علیانی والا اور ایک ہے ہمارا چشتی نئی والا۔

ارشاد برابر سکرانے جا رہا تھا۔

”بڑی بے ہودہ بات کہہ رہے ہو ارشاد! چشتی کا بھو اور تلخ ہو گیا تھا۔

ارشاد کو اب محسوس ہوا کہ اس کے دوست کا سو ڈھڑا بھر گیا تھا۔

”آؤ کمیشن چلتے ہیں۔ غور، دفعت اور ظہیر سب وہیں بیٹھے ہیں؟“

ارشاد نے چشتی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کمیشن میں لے آیا۔ غور، دفعت، ظہیر نے فوراً اٹھ کر اسے گھیرے میں لے لیا۔

”چشتی یار۔ کیا ریٹائرمنٹ کے بعد ملٹی پجانی شروع کر دی ہے؟“ غور بولا۔

”ویسے ٹی تیار ہے! اتھوں میں کبھی خوب ہے! دفعت بولا اور ہنسنے لگا۔

”چشتی جہاں! میں سوچ رہا ہوں ریٹائرمنٹ کے بعد میں وصول کیا کروں گا۔ ملٹی وال لاؤ

بل ہی گیلے؟“

چشتی کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ضبط نہ کر سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟

اس نے خشکی سے کہا۔

ارشاد کے سوا باقی تمام دوست صحت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ ارشاد کو نثر پر گیا جو

صاحب کو نثر پر تھے ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے یسکی دراز کھولی اور ایک تہہ کیا ہوا اخبار

ارشاد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ارشاد وہاں پر گیا اس نے اخبار کا صفحہ کھولا اور اسے چشتی کے آگے پھیلا

دیا۔ اخبار کے اس صفحے پر چشتی کو ہاتھ میں ملٹی لے ایک کوچ پر دکھایا گیا تھا اور نیچے یہ سطر

درج تھی!

”ریلوے کے سابق انسپکٹر علی چشتی اپنی بڑا سزا ملٹی کے ساتھ جو انہیں علیا ملٹی دے لے نے

نا معلوم وجہ سے دی تھی؟“

چشتی کے قن بدن میں آگ ہی ٹوٹ گئی۔ ”ان لوگوں کا یہ حوصلہ۔ یہ کیا کہو اس کلمہ دی ہے؟“

اس نے اخبار پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”یہ تپ سائیں: محمود نے کہا۔

”چشتی صاحب: کچھ اور بھی معلوم ہے۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ: ظہیر یہ کہہ کر نگلیوں سے چشتی کے جہرے پر باری بات کا وہ عمل تلاش کرنے لگا۔
”کیا لکھا ہے؟“

”اس نے لکھا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد چشتی صاحب نے نوادر جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اور یہ فیڈرٹی بھاری قیمت پر نوادر کے کسی سٹاف کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ ظہیر دھماکا یہ خبر پرسوں کے اخبار میں تھی۔ اخبار میرے گھر میں ہے۔“

”بھروسہ، لغو، سبیل: چشتی کی آنکھوں سے شرارے سے نکلے گئے۔
ارشاد کے اندازہ لگایا کہ اس گھٹک کو آگے بڑھایا گیا تو سرید تلخی پیدا ہو جائے گی۔ وہ چشتی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کینٹین سے باہر لے گیا۔
”چھوڑو یار! یہ بھی کوئی قصہ کرنے کی بات ہے۔ وہ ٹی تمہارے بھلا پاس کیوں رکھو جھوڑی ہے؟“
”تو کیا کروں؟“

”کی کرو۔ اس مسئلے پر سوچنا چاہیئے۔“

چشتی گھر پہنچا تو اس کا موٹا ہیٹ خراب تھا اور جب بیوی نے اسے بتایا کہ اس کی فریج بھی میں ایک اخباری رپورٹر آیا تھا تو وہ گرج کر بولا: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جیسے تمہارے کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ میں ان بدصاحبوں پر کس کر دوں گا۔ خواہ تو وہ ایک شریف اور معزز آدمی ہو پریشان کر رہے ہیں۔ توجہ دے اس کی بات کا کوئی فوٹس نہ لیا اور گھر کے کاموں میں مصروف رہی۔ وہ گھنٹے بعد وہ اس کے پاس آ بیٹھی اور بولی: وہ کبھے یہ مسئلہ اس طرح حل نہیں ہوگا۔
”تو کس طرح ہوگا؟“ رضید قرین منٹ خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی: اس نئی کامیاباز متی دار طیارہ کا بیلبے۔“

چشتی کو احساس ہو گیا کہ اس کی بیوی کوئی معقول تجویز بتانے والی ہے۔ تو بھرا اس نے

سوال کیا۔

”حق دہن داری کو ملنا چاہیئے۔ ہم بھی اس مصیبت سے نجات پائیں گے۔“

جنتی کو احساس ہو گیا کہ جس تجویز کو وہ معقول سمجھ رہا تھا وہ اتنی معقول نہیں تھی۔

”رضیہ تم اس بات کو بھول گئیں، علیا کو اپنے بیٹے پر اعتماد نہیں تھا۔ ابراہیم نے بتایا تھا کہ اس کا بیٹا منظور اہل بڑی صحبت میں خراب ہو گیا ہے۔ ان کیوں میں پڑا رہتا ہے۔“

”یہ سب کچھ آپ مجھے بتانے کی ہیں، مگر میں اس مصیبت سے اسی صورت میں نجات لے سکتی ہے کہ نفی علیا کے بیٹے کے حوالے کر دیں۔“

براہمہ والے ہیں جسے نہیں دیں گے کوئی نہ کوئی ٹوٹا چھوڑتے رہیں گے۔“

جنتی اور رضیہ در تک اس موضوع پر غور کرتے رہے، آخر طے پایا کہ جنتی منظور سے کو ڈھونڈے گا۔ وہ شہر کے کسی نہ کسی ٹیکے میں غرور دل چلنے لگا۔ دوسرے دن سے جنتی نے اپنی ہم کا آغاز کر دیا۔ ٹیکے میں جانا اسے بڑا عجیب لگا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں کسی ٹیکے کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا۔

وہ ایک ٹیکے میں پہنچا اور ابھی اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا کہ اسے یوں غسوس ہوا جیسے بدبو سے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ بڑی عجیب نعروں سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں وہ باہر نکل کر آگھر آکر اس نے یہ فریضہ راجو کے سپرد کر دیا۔ راجو ہر روز دو تین گھنٹے آگھر سے باہر آؤارہ گودی کرتا تھا۔ اصرار پس آکر بتانا تھا۔ صاحب جی منظور نامی کوئی آدمی نہیں ملا۔

چار دن بعد وہ خبر لایا منظور ابلی گیا ہے۔ صاحب جی؟

”کہاں ہے؟“

”ایک ٹیکے میں۔ پر آپ اسے دیکھیں گے تو ٹھہ جائیں گے۔ بڑی خراب حالت ہے اس کی۔ جنتی اسی وقت راجو کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔“

موجی دھارے کے اندر ایک نیکی کی ہشتی پرانی چٹائی کے اوپر پڑیوں کا ایک ڈھا پنچر پڑا تھا جسے راجو نے منظور اکبر کو پکارا تو وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ہشتی اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنی کوٹھی میں لے گیا۔

وہ بھی، یہی باتیں کرتا تھا ہشتی نے مطلب سمجھا کہ جب اسے ہوش آئے تب فنی اس کے حوالے کر دے۔ دوسرے روز صبح نو بجے اس کی حالت میں اچھی خامی تبدیلی آگئی۔ باپ کی موت کا ذکر سن کر زار و قطار رونے لگا۔ بڑی شکل سے ہشتی نے اسے نشانہ کروایا اور فنی اس کے حوالے کر دی۔ منظور سے نئے فنی کو کئی بار چننا، اور چلا گیا۔

اسی وقت ہشتی نے ایک خبر بیان علیا کی فنی اس کے بٹے منظور کو دے دی گئی ہے اب نامرطی ہشتی کو فنی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

فنی گھر سے چلی گئی تو ہشتی کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک کانا جو اس کے ذہن میں جھوٹا تھا دور ہو گیا ہے۔

اس نے جو خبر اخباروں کو بھیجی تھی وہ چھپ گئی تھی اب اس نے پھر اپنے روزمرہ ممولات پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا مٹی مٹی سیر میں کرتا تھا اور پرانے دوستوں کے ہاں بے ٹکری کے عالم میں گھٹکھڑکتا تھا۔

اسی عالم میں تین مہینے گزر گئے۔

اس روز اور وہ دن اتوار کا تھا جب وہ شام کے قریب اپنے ایک دوست کے بچے کی سالگرہ میں شامل ہونے کے بعد گھر واپس آیا، اور جیسے ہی ڈرائنگ روم میں پہنچا، اس کی آنکھوں تلے ایک شعلہ سا لہرا اٹھا۔ فنی تپانی کے اوپر پڑی تھی۔ رضیہ! رضیہ! وہ چیخا۔
رضیہ بھاگی آئی۔ کیا ہوا؟

”یہ کیا ہے کیا مصیبت ہے؟“ اس نے فنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
”وہ منظور!۔۔۔ مر گیا ہے نیکی میں۔۔۔ اس نے مصیبت کی تھی کوئی آپ کے ہاں ہینچاری

جائے۔ نیلے والے دے گئے ہیں۔ میں کیا کرتی؟

چشتی مگر جنے نکلا: مگر تم کے بکوں لے لی۔ واپس کر دیتیں۔ کہہ دیتیں ہمارے گھر
میں نہیں رہے گی۔ تم کو پتا نہیں تھا کہ اخبار والے جان نہیں بھڑکیں گے؟

رضیہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ راجہ دوداڑے کے اندر آیا: صاحب جی۔ وہ آئے ہیں جی

۔ وی جی۔ اخبار والے۔

”کیا؟“ اور چشتی دونوں ہاتھ کینٹھوں پر رکھ کر صوفے میں گر پڑا۔

اس کی خاطر

چند روز پہلے میرے ایک دوست نے یہ واقعہ بتایا تھا اور آج میں اسے اپنے الفاظ میں ڈھلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میرے دوست نے کہا تھا۔

ساڑھے ساڑیس برس تک صبح سے لے کر شام تک کام کرنے کے بعد میں بڑی طرح تھک گیا اور محسوس کرنے لگا کہ بقول مرزا غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں با سب سے بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ پہلے اکبری دروازے سے مٹان روڈ تک سائیکل چلا کر آئی تکلیف بات نہیں تھی لیکن جب میری کمپنی نے مٹان روڈ سے گلبرگ میں اپنا دفتر منتقل کر لیا تو ٹما گئیں جو سب دینے لگیں۔ بیوی نے مشورہ دیا کہ دفتر چھوڑ دو اور جو رقم دفتر سے لے کر اس سے کوئی کاروبار کر دو گارے کی ابھی صورت نکل آئے گی۔ میں بھی اس کے لئے تیار ہو گیا مگر کمپنی کا چیئرمین مجھ جیسے تجربہ کار ڈرافٹسمن سے عہدہ ہونا پسند نہیں کرتا تھا اس لئے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میری پرانی منادات کا ذکر کیا تو خواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر کے یہ رعایت بھی دے دی کہ اگر تم چاہو تو کمپنی تمہیں کار خریدنے کے لئے مناسب رقم بلا سود مقرر کر دے سکتی ہے جسے تم آسان قسطوں میں لٹا دیتا۔

یہ کوئی خاص سہولت نہیں تھی مگر اس وقت ایک بڑی رحمت محسوس ہوئی۔ سوچا ساری عمر ٹانگوں کو گھمایا ہے اب ذرا کار گھما کر بھی دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا راحت ملتی ہے۔ میرے ایک دور کے عزیز ہیں۔ پیشہ کے لحاظ سے ٹھیکیدار ہیں انہوں نے ٹھیکیداری میں

خانہ کم اور نقصان زیادہ اٹھایا تھا لیکن جب ان کے دوڑے بیٹے دوہئی میں برسلا لائونٹ چلے گئے تو گھیا پیسے کی بارش ہوئے مگر اب تو یہاں یہی پرانی چیزیں اپنی شان سے کم تر خیالی کرنے لگے۔ چنانچہ پرانے ماڈل کی ڈائمنڈ کھڑکیوں سے گر گئی۔ نئی اینٹ خرید لی پرانی کار کا جدید مفعول تھا۔ انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ بجے بڑی کمپنی کار خریدنے کے لئے معقول رقم دینے پر آمادہ ہے۔ فوراً غریب خانے پر تشریف لائے اور بڑے بیچاس ہزار کا مال ہے۔ تیس ہزار میں جا کہہ دے۔ نو بعد میں دیکھا ڈگے۔ میں بعد میں پچھتا نا نہیں چاہتا تھا۔ کمپنی کے چیرمین سے گفتگو کر کے مطہر رقم ان صاحب کے حوالے کر دی اور گاڑی خرید لی۔

گاڑی آگئی۔ میں نے زندگی بھر سائیکل چلائی ہے۔ گاڑی کا تو کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی آئی تو ڈرائیور کو بھی آنا چاہیے تھا۔ گاڑی دولے دوستوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مدد کی اور ہر روز ایک نئے ڈرائیور کا انٹرویو ہونے لگا معلوم ہوا کہ یہ لوگ بڑے لوگوں کی گاڑیاں ڈرائیور کرتے رہے ہیں۔ چھوٹی رقم ان کی نظروں میں نہیں تھی اور ادھر میری یہ مجبوری کہ اگر آدھی تنخواہ ڈرائیور ہی کو دے دوں تو گاڑی کی قسط اور گھر کے اخراجات کے لئے دھیرے کہاں سے گاؤں۔

گاڑی جتنی آسانی سے سیر ہوئی تھی۔ ڈرائیور کا حصول ای قدر مشکل ہو گیا۔ سوچا خود ہی کوشش کر کے ڈرائیونگ سیکھ لوں مگر یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ پہلے دن ہی پیسہ پیسہ چو گیا اور یہ بھی امکانات ہوا کہ طویل اور سخت محنت لے مجھے اعصابی مریض بھی بنا دیا ہے۔ ایک اعصابی مریض کے لئے کار ڈرائیونگ خطرے سے خالی نہیں بس ڈرائیونگ کے نام سے کانوں پر مٹھ دیکھا اور ایک بار پھر ڈرائیور کے لئے کوشش کرنے لگا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ ایک اچھے فٹ بال کھانڈی دروازے پر آکر بولا۔ صاحب جی ! آپ کو ڈرائیور چاہیے۔ میرا نام حسن ہے۔ آپ کو جو ہدی فتح محمد نے بتایا ہو گا کہ میں کیسا ڈرائیور ہوں۔ مجھ سے کسی فتح محمد نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ شام میں مصلحتاً خاموش رہا۔

چاہتا تھا کہ یہ اگر مناسب تنخواہ ملگے تو اسے رکھ لیں۔

اس کے جتنے پر ایک نگاہ ڈالی۔ تو انا آدمی سلوم ہوتا تھا۔ عمر بیس سال سے کم کیا ہوگی
شوروی بہرہ اشت بھر داسی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ رنگ درود، کمال بچکے ہوئے، پیشانی نراغ، پہلی
نظر ہی میں بتا چل گیا کہ زندگی نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ نہ جانے کن کن
تعلیق خبرات سے گزر چکا ہے۔

میں نے پوچھا۔

”تیس ڈرا میٹنگ کا کتنا تجربہ ہے؟“

اس نے سوال سنتے ہی کئی ایسے صاحبوں کے نام گنوا دیئے جن کی گاڑیاں ڈرائیو کر چکا تھا۔
”میرا دوسرا سال یہ تھا کہ تنخواہ کیا ملے؟“

”جو بھی آپ خوشی سے دے دیں۔“

یہ فقرہ خطر سے خالی نہیں تھا نہ جانے کیا مانگ بیٹھے۔ مگر کہ اس نے تنخواہ کے بارے میں
کسی بڑے آدمی کے ڈرائیو کی طرح گشتگو نہیں کی تھی۔ اس نے میں نے کہا، اگلے کام شروع کرو۔
تنخواہ کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میرے فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔ بے اختیار مصافحے
کے لئے اس کے ماتھ میری طرف بڑھ گئے۔ مگر مجھے اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ وہ لوکر تھا۔ ڈر کر
اپنے مالک سے مصافحہ نہیں کرتا۔ تاہم میں نے مصافحہ کے اسے رخصت کر دیا۔

جس روز اس نے گاڑی شارٹ کی میرا دل بڑی طرح دھوکا دیا تھا۔

میں نے اپنی طرف سے بڑی کم تنخواہ بتائی اور وہ بھی اس نے قبول کر لی۔ اس پر میں پریشان
ہو گیا کہ کہیں نا تجربہ کاری کی وجہ سے کوئی ایسی ڈنٹ نہ کروے۔ جی چاہا کہ دونوں حسن دینے بھرکی
تنخواہ لواء رجحانی کر ڈ۔ لیکن نہ جانے کیوں احساس ہوئے مگر اسے میری اس بات سے
بڑا دکھ ہو گا۔ اس لئے اس سے کچھ نہ کہا۔

دن پر دن گزرتے گئے اور وہ باتا حدہ طور پر میاڈا خوردی گیا۔

صحن کی ایک بات جو مجھے پسند آئی وہ یہ تھی کہ اس سے جو کچھ بھی کہا جاتا تھا بڑی پھرتی سے کر دیتا تھا۔ گھر سے آتے ہی کار صاف کرنا تھا۔ بڑی اچھی طرح اس کا جائزہ لیتا تھا کہ کوئی غلطی تو نہیں ہے۔ میں ناشتہ کر کے دروازے ہی پر ہوتا تھا کہ وہ جھٹ اپنی سیٹ پر جا بیٹھتا تھا۔ اس کی یہ پھرتی دیکھ دیکھ کر میں خوش ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی ذہان سے یہ خیال کیوں آ جاتا تھا کہ وہ اتنا پھر تپتا ہے نہیں صرف مجھے خوش کرنے کے لئے تیزی دکھاتا ہے۔

میری کوشش یہی تھی کہ وہ مجھے ٹانگ بٹھے اور خود کو نوکر گر یہ سلسلہ دیر تک چل نہ سکا۔ ایک روز جب اس نے مجھے اپنے حالات بتائے تو وہ صنفی دوا پر جو ہم دونوں کے درمیان کھڑی تھی غور مکی۔

اس نے بتایا۔ صاب جی! میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ گھر میں صرف ایک بہن ہے۔
”اور کوئی نہیں؟ میں نے پوچھا۔

”نہیں صاب جی! اور کوئی نہیں۔ صاب جی! کلکٹرم لہجہ سے گیارہ برس چھوٹی ہے۔ کسی اچھے گھر میں ہوتی تو اب تک اس کا بیاہ ہو چکا ہوتا۔“
”تو تم نے اس کا بیاہ کیوں نہیں کیا۔؟“

”جی سرور کی ذات بھلا کیا کر سکتی ہے۔ یہ کام بائیں کرتی ہیں۔ اس کی ماں نہیں ہے۔“

اس دن بس اتنی ہی گفتگو ہوئی تھی۔ نے عموں کیا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے لیکن کہ نہیں سکا۔ صحن اپنی ڈیوٹی بڑی مستعدی کے ساتھ پوری کرتا رہا۔ مجھے اس سے کسی قسم کی شکایت نہ پہلی وہ افراد کو بھی آ جاتا تھا اور پوچھتا تھا۔ کیوں صاب جی! آپ کو کہیں باہر تو نہیں جانا مگر میں چینی کے روز بچوں ہی کے ساتھ رہتا پسند کرتا ہوں کہیں بھی جانا آتا نہیں ہوں۔

ایک تو اور وہ اسی طرح آگیا تو میں نے کہا۔

”دیکھو صحن! جب میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ افراد کو مت آیا کرو۔ پھر آج کیوں آ گئے ہو؟“

یوں لگا وہ بکھوٹے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔

”کیوں حسن! کچھ کہنا چاہتے ہو، تنخواہ بڑی چاہیئے؟“
”جی نہیں۔“

”پھر کیا معاملہ ہے؟“

وہ دو تین منٹ گھاڑی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ پھر بڑی لمبا جوت سے بولا۔

”صاحب جی! بہن کی بڑی حقے داری ہے مجھ پر۔“

”میں نے کچھ لیا کہ وہ بہن کی شادی کے لئے رقم مانگتا ہے۔ میں خود قرض میں جکڑا ہوا تھا اس کی کیا مدد کرتا۔“

”حسن! میں نے کہا۔ میں نے تم کو بتایا نہیں تھا کہ بڑی کمپنی کے پیسے سے خریدی تھی اور میں ہر ماہ اس کی قسط دیتا ہوں۔ گھر کے اخراجات ملگ ہیں؟“

”صاحب جی! میں ادھار کب مانگتا ہوں؟ وہ بے تابی سے بولا۔

”ادھار نہیں مانگتے تو کیا چاہتے ہو۔؟“

”اس نے ڈک، روک کر اپنا عذریہ واضح کر دیا۔ اصل میں اسے بہن کے لئے مناسب رشتہ ڈھونڈنے میں بڑی وقت پیش آرہی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ کام عورتوں کے ہوتے ہیں۔ مردوں کے نہیں۔ اور وہ چاہتا تھا کہ میری جہوی اس معاملے میں اس کی مدد کرے اور کوئی موزوں بڑا ڈھونڈ دے۔“

”اچھا میں کوشش کروں گا؟“

”میں نے اسے فلی دی اس نے میری جہوی کو بھی آگاہ کر لیا کہ وہ کوئی مناسب بڑا ڈھونڈ دے گی۔“

”کام کی مصروفیت میں نہیں اس کی درخواست بھولی گیا سات دو گز سے ہوں گے کہ وہ پھر چٹنی کے دن آگیا۔“

صاحب جی! کچھ کیا ہے آپ نے؟ آسنے آتے ہی سوال کیا۔
مجھے سخت غصہ آیا۔ کیا اتنی انسان ہے، بڑا صوفیہ کوئی مذاق ہے، آنکھوں میں کیسے
رشتے کی بات چل سکتی ہے؟

حسن: باگلی ہو گئے ہو تم؟ اتنی جلدی کیا ہو سکتی ہے؟ میرے کام کو:

پر صاحب جی!۔۔۔ وہ۔۔۔ صاحب جی! مجبور ہی ہے نا:

مجبور ہی کیا ہے؟ مجھے اس کی بات پر سخت غصہ آ گیا۔

وہ خاموش رہا اور اس کی صورت بتا رہی تھی کہ اس کے اندر کوئی شکستہ جاری ہے۔

مجھے اپنے پیچھے پرائسوں کی ہونے لگا اس لئے ذرا نرمی ہے کہا۔

حسن: ایسے معاملات کچھ سوچ کر کئے جاتے ہیں۔

حسن نے رندھے ہوئے گلے سے ہوں کہا اور گاڑی صاف کرنے لگا۔

میری بیوی نے یہ ساری گفتگو سن لی تھی۔ میں اندر گیا تو بلی۔

آپ نے اچھا نہیں کیا۔ پادری رضیہ بھی جہان ہونے والی ہے یہ سنا امیر جو غریب ہر

ایک کو میٹھا آتا ہے۔

ابناک میری نظر اپنی بیٹی پر پڑی جو بارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں

خیال آ رہا کہ حسن کی بہن دو گنی عمر کی ہوگی جیسی تو وہ اس قدر پریشان ہے

ابھی دلوں میرے دفتر میں ایک لڑکا بطور کلرک کام کرنے کے لئے آیا۔ کم گو، اطاعت

شمار، نیک خصلت، ایک ہفتہ بعد ہی میں اس کے بارے میں سوچنے لگا، سوچا اگر یہ کنوارا ہو

تو حسن کی بہن کے لئے رشتے کی سہرت نکل سکتی ہے۔

باتوں ہی باتوں میں میں نے اس کے حالات معلوم کر لئے وہ ماں باپ کا اکٹلا بیٹا تھا

باپ ریورے سے ریٹائر ہو کر اپنے غلے کے اندر ایک چھوٹی سی دکان میں عام استعمال کی چیرائی

بیچتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے چھوٹے سے کنبے کی مالی حالت اس قابل نہیں ہے کہ

وہ کسی اچھے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے اس نے ممکن ہے کہ اس کے والدین سن کی بہن کو بہو بنانے پر رضامند ہو جائیں۔ بیوی سے ڈر کر کیا تو اس نے کہا۔

پہلے یہ بہتہ چلا کر کہیں تیار سے اس کمرک کی گنگنی نہ ہو چکی ہو اگر گنگنی ہو گئی ہو تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا جائے گا۔

بات مقبول تھی۔ یوسف سے دریافت کیا تو اس نے گنگنی سے انکار کر دیا۔ اب میری بیوی کا مشورہ یہ تھا کہ حسن کے ہاں جا کر ایک نظر اس کی بہن پر بھی ڈال لینی چاہیے۔ کہیں زیادہ عمر کی نہ ہو۔

حسن سے اس کے ہاں جانے کا ذکر کیا تو وہ اس طرح حش نظر آئے لگا جیسے اسے کوئی خوشخبری مل گئی ہے۔

وعدے کے مطابق اتوار کے دن ہم اس کے ہاں جا پہنچے۔ دو کمروں پر مشتمل اس کا گھر تھا لیکن میں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہھر میں اعلیٰ درجے کا فریج فری سیلف منی سے دکھا ہوا ہے۔ ہمرنے صاف ستھری مٹی، اور اس وقت ہماری حیرت اور بڑھ گئی جب ہم نے حسن کی بہن کلثوم کو دیکھا اس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جو میری بیوی کو بھی میسر نہیں تھا۔ پھر اس نے اس طرح سیٹنگ سے ہماری خاطر مدارات کی کہیں تو متاثر تھا ہی میری بیوی مجھ سے بھی زیادہ متاثر ہوئی۔

ہم گھر سے نکلنے لگے تو حسن نے راستہ روک لیا۔

”ہم صابجی، میری کلثوم ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔
ہم صابجی، خوش حش ایسے گھر میں رہے تو مجھے دنیا کی سب نعمتیں مل جائیں گی ہرگز نہیں
حیرت ہے، اس کا بھائی بیواہ جو مجھے ایک اندوہنی جذبہ سے اس کی آواز نکالتا ہے،
ہم نے اسے قتل دی کہ اگر خدا نے چاہا تو ہماری بہن کے ہاتھ جلد ہی پتہ ہو جائے گا۔
وہ اپنے گھر میں خوش رہے گا۔“

میں نے یوسف کے باپ سے پوچھا کہ اگر آپ کے بڑے کا رشتہ ایک ایسی لڑکی سے
 طے پا جائے جس کا باپ ڈرا بڑا ہو تو کیا آپ کو اعتراض ہو گا؟

بولے: نہیں جناب!۔ اگر لڑکی سگڑے تو مجھے اس پر تعلقاً کرنی اعتراض نہیں ہو گا اس کا
 باپ ایک ڈرا بڑا ہے۔ میں خود کیا ہوں آخر ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھ کر ہندی، مریچ لڑھکھو
 بیچنے والا۔ یوسف! آپ کا بیٹا ہے۔ اس کے رشتے کا آپ کو پیرا بچہ اختیار ہے۔
 اور فون گھروں میں خادی کی تیلدیاں شروع ہو گئیں اور آپ دن بھر دھن دھن بن کر یوسف
 کے گھر چلی گئی۔

... سے روزِ حسن میرے گھر آیا تو فکر یہ ادا کرنے کی کوشش میں اس کے ہونٹوں سے الفاظ
 نکب میں نکلتے تھے میں نے دیکھا کہ اس کی ہیکس آنسوؤں سے بھیل ہوئی ہیں یہ خوشی اور
 سائنسی کے آنسو تھے۔

وہ بدستور اپنی ڈروٹی پر آئے لگا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اب اس میں پہلی سی پھرتی نہیں۔
 کام باتا عدلی سے کر رہا تھا اس نے مجھے کچھ کہنے سننے کی کیا ضرورت تھی۔
 ایک دن بیٹے کی خام کو آ یا اور کہنے لگا۔

صاحب جی!۔ آپ نے مجھ پر ایسا احسان کیا ہے کہ میں جب تک زندہ ہوں۔ یہ بھول نہیں
 سکتا میری کھنوم بڑی خوش ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ اور صاحب جی! کل وہ بچہ جو
 د کے سامنے خان صاحب دہکتے ہیں نا وہی لال مکان والے۔ آپ کے دوست ہیں۔ وہ
 صاحب جی! بال بچوں کے ساتھ مری گئے تھے وہ دیکھے کے لئے جی۔ وہ کیا ہوئی ہے سوز۔
 اس نے شوقِ عمل بھی نہیں کیا تھا کہ میرے بچے سونا مال، سونا مال کا شور مچاتے تھے۔
 لے چلوں گا۔ لے چلوں گا حسن بھی شور مچائے لگا

... صاحب جی! میں نے اس سے کہا کہ خدایا ایک دہائی سے
 ... میں نے اس سے کہا کہ خدایا ایک دہائی سے

قدم ڈالنے لگے تھے۔

”صاحب بی! میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں کہ چوں کی یہ چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کر دوں۔
آپ تھوڑے میں سے چٹول کے پیسے کاٹ لیں۔“
”نہیں۔ تم شاید چار ہو۔ چٹول کے خرچ کی تو کرنی بات ہیں۔“
”یہی ٹھیک ہوں صاحب بی! میں ٹھیک ہوں۔ بھلا مجھے کیا خواہ ہے۔ کلی اتوار ہے۔ میں
سب سے آج ہاؤس نکال رہا ہوں صاحب بی! اہانتا رہیں تو اپنی کلثوم اور يوسف —
”کیوں نہیں۔ انہیں ضرور ساتھ لے آؤ۔“

نوارہ و برادران ہر اسی سمت کے عالم میں گزرتے رہے خوب خوب دھڑکتے اٹھا یا گزرا
تھوڑے ہی دنوں میں جڑی ہی میں زیادہ وقت بیٹھا رہا۔ بلا ہر شکل کو گھوما پھرا نہیں۔
یہ وہی قہقہہ تھی کہ ”آیا“ ”نہی“ اور بدھ کے دن بھی گزر گئے۔ میں اس کے گھر پہنچا یا جتا تھا
کہ بھوکے نے منع کر دیا۔

آدھی چار چار ہو جاتا ہے چند روز اسے گھر میں آرام کر لینے دو۔
آٹھ دن میں دیکھنے ہی میں دفتر آتا جاتا رہا۔ چار دن دفتر سے چھٹی لے کر عزیزوں کی شادیوں
میں شرکت کی۔ اب تو اسے کہا نا پہلے بیٹے تھا۔ کیوں نہیں آیا۔ میں نے سوچا۔
دو دن اور گزرے تو اس کے یہاں گیا۔ وہاں سے پردہ تنگ دی تو کلثوم آئی۔
”تیار اچھائی کہیں چار تو نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ سب اٹھاؤ سن کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بھڑائی لگ گئی۔“

”کیوں کلثوم؟ کیا ہوا ہے؟“

”جی۔ وہ تو۔ وہ تو اور کلثوم کی بچی بندھ گئی۔“

”بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ سن رہا ہے۔“

”کب؟“

بیس روز۔ ہم مری سے آئے۔ وہ گھر آکر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہم ہسپتال میں لے گئے
 ڈاکٹروں نے کہا انہیں سرطان ہے پرانا اور پٹھنے کی رات کو وہ چلے گئے۔ انہوں نے کبھی اپنی
 بیماری کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ۔۔

ہاں کلثوم یہی اور صرف تمہارے لئے جیتا تھا۔ میں جانتا ہوں؟
 اور جب میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو حسن کے الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونج
 اٹھتے تھے۔ میری کلثوم یہی میرے لئے سب کچھ ہے میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔ میری بیس
 ایک صبر ہے۔ اس کا جلدی پیارا ہو جائے۔

ایک منزل کئی راہیں

اس رات راشد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ کئی بار کونسل بدل کر سونے کی کوشش کر چکا تھا مگر نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اسے ہر روز کم و بیش چودھ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس قدر تھک جاتا تھا کہ بستر پر بیٹھے ہی سو جاتا تھا۔ اس رات بھی غنودگی کا غبار اس کے اعصاب پر چھا گیا تھا مگر معاملہ یہیں تک رہا تھا، اور تھوڑی دیر بعد یہ غنودگی بھی ختم ہو گئی تھی۔

راشد پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا، عام ڈاکٹروں کی طرح صحت مند، توانا، قوی، کسی ہسپتال سے وابستہ ہونے کی بجائے اس نے پرائیویٹ پریکٹس ہی کو ترجیح دی تھی اور اس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ جب سے ڈاکٹر بنا تھا سناٹھی مسند گویا اس کی زندگی ہی سے نکل گیا تھا۔ بیٹے میں تمام اخراجات بردے کر کے بھی، اس کی بچت کبھی فریضہ اور کبھی دم مرط ہو جاتی تھی مگر وہ، بلکہ میں جمع کر لیتا تھا۔

اس کے پاس صرف اس کی ماں رہتی تھی، دونوں بھائی امریکہ میں تھے اور بیٹیاں بھی اپنے گھروں میں آباد ہو چکی تھیں اور لندن میں رہتی تھیں ماں کی بڑی آرزدہی کو اس کے گھر میں بہا آئے، مگر وہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں تھا، شاید وہ کسی اچھے وقت کا انتظار کر رہا تھا یا کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جسے بیڑی اپنی رفیقہ حیات بنا کر گھر میں لے آئے۔ ماں کا نقطہ یہ خیال تھا کہ وہ خوشگوار مستقبل کے لئے دو پیسہ جمع کر رہا ہے اور یہ دوسرا بھی کمالی مقدار

میں ظاہر نہیں ہوا۔

دور سے گھڑیاں کی آواز آنے لگی۔ شن شن کی آواز دو مرتبہ گونجی، دو بج گئے ہیں اور میں جاگ اُٹھوں۔ یہ احساس اسے عجیب سا لگا۔ وہ سر پٹوں کو بار بار سکون اور دوا سے چمکا تھا اور اس رات وہ خود سکون سے محروم تھا۔

وہ خود بھی دوا استعمال کر سکتا تھا لیکن اس کی چھٹی جس اسے بتا رہی تھی کہ اس کو جلگے رہنا ہی ضروری ہے۔

”کیس ای کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ اور یہ سوچتے ہی اس نے اپنی خوابگاہ کا اندازہ آہستہ سے کھولا، صحن کی جتنی جلائی، اپنی امی کے کمرے میں چھا بکھنے کی کوشش کی۔ وہاں کھل سکتا تھا، جو ظاہر کر رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔“

واپس کمرے میں آکر اس نے ٹیبل ٹیپ روٹن کیا اور کتابوں کے ریک سے ایک کتاب اٹھالی، طالب علی کے زمانے میں ادبی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا تھا اس نے اس کے یہاں بیڈ ٹیکل کتابوں کے علاوہ کچھ شعروادب کے مجموعے بھی فریے سے رکھے۔ جتنے تھے جنہیں وہ کبھی کبھی فرصت کے اوقات میں کچھ دیر پڑھ لیتا تھا۔ اس وقت اس نے جو کتاب اٹھائی تھی وہ بانگ درا تھی اس نے کتاب کھولی اور نظم کے عنوان پر اس کی نظر پڑی بھی نہیں تھی کہ ایک نخت اسے یہ احساس ہوا کہ کوئی دوا اسے پر آپا ہے اور اس نے کلاں میل پر اپنی انگلی رکھ دی ہے۔

رات کے وقت کسی مریض کے یہاں جاتے ہوئے اسے خامی تکلیف ہوتی تھی مگر وہ اسے ڈاکٹر کی ڈیوٹی سمجھ کر بہہ لیتا تھا کبھی اس نے اس مسئلے میں شکوہ نہیں کیا تھا اس کے کمرے کے دلائل کی طرف کھینے والی کھڑکی کا شیشہ چمک اٹھا تھا۔ دلائل کی جتنی جلائی تھی۔

”امی کے سوا اور کون جلا سکتا ہے؟“ اس نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے میں اس کی امی کی آواز آئی۔

ڈاکٹر کو گشت پرست کا نہیں رہے گا آدمی سمجھتے ہیں۔

کوئی آریسے امی؟

بڑی سی خاتون نے بیٹے کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا فقرہ مکمل کیا جسے آدمی کی

مزدورت نہیں ہوتی:

کوئی بات نہیں امی ابھی ہینڈ نہیں آ رہی تھی:

کیوں راشد بیٹا؟

ہینڈ نہیں امی کیوں —؟ اور وہ باہر جانے لگا بیرونی دروازہ کھولا تو ہوا کا ایک

تیز و تند جھونکا اس کے چہرے سے غصے کے کہیں چھا گیا۔ نیم روشن اور نیم تاریک فضا میں وہ آنے والے کا چہرہ نہ دیکھ سکا صرف آواز سن سکا۔

جناب ڈاکٹر صاحب! مہربانی کیجئے:

کوئی SERIOUS CASE ہے؟

وہ رات کو آنے والے شخص سے یہ بات حذور پر چھتا تھا۔

مہربانی کیجئے:

والہان میں جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی میں اس وقت راشد اجنبی کے چہرے کو غور سے

دیکھ سکتا تھا، لمبی ناک، کشادہ پیشانی، سر پر گھنگھریلے بال جن میں کوئی ہیریز چمک رہی تھی۔

کہاں سے آئے ہیں؟ راشد نے سوال کیا۔

پہلانی انارکلی سے۔ جناب! میں وہاں پر آیا تھا، آپ نے سکون آور گویاں دی تھیں۔

مرضہ کے لئے۔ اب اس کی حالت بڑی خراب ہے جناب: آپ کو یاد آگیا ہوگا؟

ٹھیک ہے۔۔۔ دن میں بے شمار مرضی آتے ہیں:

جناب! کیسی مل نہیں سکی؟

چلتے ہیں نہ راشد اندھ گیا، اس کی امی درد مند ہے پر کھڑی تھی۔

”اُمی! قریب ہی جانا ہے، پرانی اندر کلی میں، آپ سو جائیں، غفور کو آواز دے کر جگائیں
دردانہ کھول دے گا: اُمی نے اثبات میں سر ہلایا۔ راشد نے میز کی دراز میں سے گاڑی کی
چابی نکالی اور واپس جانے لگا۔

غفور کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی، وہ شور مچ کر بیدار ہو چکا تھا اور گیلوچ کے پاس
کھڑا تھا۔ دو سنت بعد گاڑی ساتھ روٹ پر چلی جا رہی تھی۔

ہوا میں تیزی اور تندہی تھی، اوپر فضا میں بادل پھیلے ہوئے تھے رہا ش کا آغاز نہیں
ہوا تھا۔ راہ میں خاموش تھیں کبھی کبھی کرنی رکشایا گاڑی قریب رکھائی دیتی تھی اور پھر نظروں
سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

جنسی راشد کے پاس بیٹھا تھا، آگے کی طرف جھکا ہوا بار بار باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک مقام
پر پہنچ کر اس نے راشد کو رکنے کے لئے کہا۔ گاڑی پرانی اندر کلی کے درجی حصے میں ایک دو
منزلہ مکان کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔

”آئیے ڈاکٹر صاحب! میں نے جلدی سے دوسری طرف جا کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔
وہ جب راشد کا کبس اٹھانے اس کے آگے آگے بیڑھیاں طے کر رہا تھا تو اس نے
ذرا بلند آواز میں کہا: ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔“

کمرہ کافی وسیع تھا۔ ایک طرف ہنگ کے اوپر ایک دھکی آئینیں بند کئے نظر آ رہی تھی۔
”یہ ہے مریض، ڈاکٹر صاحب!“

یہ الفاظ اس آدمی نے نہیں ایک خاتون نے کہے تھے جو کڑی کھ کے کا مریض کے ہنگ
کے قریب لے گئی تھی۔

راشد نے کڑی پر بیٹھ کر مریض کی طرف غور سے دیکھا۔ دھکی کیا تھی لگ مر مرے
تراششی ہوئی ایک جڑیا تھی۔ سیاہ زلفیں رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ
سانس لے رہی تھی کہ تنفس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

”کیا ہے اسے؟ راشد نے سوال کیا۔

خاتون نے جواب دیا: ”معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب! مدین گھنٹے ہوئے اسی طرح بڑی ہے، بولتی نہیں، آنکھیں بھی نہیں کھولتی!“
راشد نے نبض دیکھی، بہت کمزوری سے چل رہی تھی، ہاتھ بڑا گرم تھا، شدید بخار میں مبتلا تھی۔

”کیا نام ہے اس کا؟“

”فاخرہ — میری چھوٹی بہن!“

راشد نے دوبارہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے تین چار بار بلایا۔ فاخرہ کدکڑ سے پکڑا بھی، مریضہ نے آنکھیں کھول دیں اور اسی لمحے وحشتانہ انداز میں بیٹھ گئی۔
”فاخرہ! یہ ڈاکٹر صاحب ہیں!“

اس نے ایک بار گھور کر راشد کو دیکھا اور پھر آنکھیں جھٹکائیں۔ اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

راشد اس سے اس کی تکلیف کے بارے میں دریافت کرتا، مگر وہ خاموشی سے کبھی اس پر ایک نگاہ غلط انداز ٹال مٹیل نہ کرتی اور کبھی اپنا ترشح دوسری طرف پھیر لیتی تھی۔ لگتا تھا وہ قوتِ گویائی سے محروم ہو گئی ہے یا اس کے اندر ایک ایسی کشمکش طاری ہے کہ کچھ کہنا اس کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔

راشد نے اسے چیک اپ کیا، وہ حیران تھا کہ یہ لڑکی بظاہر تندہست معلوم ہوتی ہے پھر اس کی ایسی کیفیت کیوں ہے!

”کیا اسے ذہنی صدمہ تو نہیں پہنچا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔
وہ آدمی بھی خاموش تھا اور وہ خاتون بھی۔ مگر خاتون کی آنکھوں سے کچھ ایسا کٹر ترشح تھا عموماً دل کی بات کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔

”خیر۔۔۔ یہ دوا دے دیتا ہوں۔۔۔ صبح ٹھیک ہو جائے تو اسے میرے کلینک میں لایئے۔۔۔ جلدی نہیں۔۔۔ بارہ بجے کے قریب دس کم ہوتا ہے ابھی طرح دیکھوں گا۔“ راشد نے یہ الفاظ سرد سے کہے تھے جو خاتون کے پاس کھڑا تھا۔

”بہتر جناب!“

راشد نے نسخہ لکھ دیا۔

”یہ ہسپتال کے پاس دو تین دکانیں کھلی ہوں گی۔“

”مجھے معلوم ہے جناب!“

مریض اسی طرح خاموش رہے جس وحشت منشی تھی اس کی لابی لابی پکوں نے آنکھوں کے نیچے سائے سے ڈال رکھے تھے۔

راشد جب گاڑی میں بیٹھا تو وہ شخص پوچھ رہا تھا،

”نیس، جناب!“

راشد نے وائٹس لم تھ کے اشارے سے سنے جو مناسب سمجھو دے دو کا اظہار کیا۔ اس آدمی نے جیب سے نوٹوں کا ایک بٹل نکالا اور راشد کے سامنے پیش کر دیا۔ راشد نے بغیر کسی اندازے کے چار پانچ نوٹ نکالے اور جیب میں ڈال لئے، بکس گاڑی کے اندر رکھا جا چکا تھا راشد نے خدا حافظ کہا اور گاڑی ٹارٹ کر دی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ آرام کرسی میں دھنس گیا سامنے کھڑکی کے دونوں پرٹ کھلے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے بار بار آپس میں ٹکرا کر کمرے کے سکوت کو بگڑ رہے تھے۔ اس کی اتنی آگہی، وہ اس سے یہ نہیں پڑھتی تھی کہ مریض باہر بیٹھ کا کیا حال ہے اس کی بولنے وہ چلنے کے لئے پوچھتی تھی۔

”ہیو گے؟“

”نہیں، امی! ذرا آرام کروں گا، باہر سرد ہوا چل رہی ہے۔“

”خود کو مٹھنا چاہنا — گرم چائے ٹھیک رہے گی۔“

انہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ راشد نے اپنے پاؤں آرام کرسی کے کچے تپائی کے اوپر پھیلا دیئے۔ مٹھا اس کے سامنے مریض کی شکل آگئی۔ وہ اس کا کوئی مرض تشخیص نہیں کر سکا تھا کیا بیماری ہے اسے؟ اس نے خود سے سوال کیا، کوئی جسامتی بیماری تو نہیں — پھر کیا نفسیاتی بیماری ہے اس نے غسوٹ کیا کہ اس کا چہرہ اس کے بالکل قریب آگیا ہے۔ مینڈو لگت جس میں کبھی کبھی جو کہ بہت ہی ہلکی اور مدھم مدھم مڑی دلا بخا لابی پکس دھونڈ پھینچے ہوئے۔

وہ اپنے بیک میں پردہ کئی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ کئی بار لکھروں میں جا کر بھی اس نے مشہور ایسے چہرے دیکھے تھے جو حسین اور دلاور نہ کہے جاسکتے ہیں مگر تاج تک کرنی چہرہ بھی کلینک سے یا کسی گھر سے اس کے ساتھ کمرے تک نہیں پہنچا تھا۔ چند منٹ آرام کر سکی ہیں۔ پھر جب وہ گرم گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگتا تھا اور اس کی انہی ٹھنڈی مٹھاں اس سے کچھ ٹھنڈی کرتی تھی تو وہ دن بھر کی کامد دہانی ٹھول جاتا تھا اور جب کبھی ناکھانے کے بعد کمرے سے چل کر تھکی کے لئے ٹھٹھا تھا تو خود کو ایک نئے ماحول میں پام تھا۔ جہاں نہ تو مریضوں کی سرچھائی ہوتی کہ ناک سمجھ نہیں ہوتی تھیں اور نہ مختلف دواؤں کے قسم و ذات اس کے ذہن کو پریشان کرتے تھے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس ذات اس نے جو چہرہ دیکھا تھا وہ ابھی تک اس کے ساتھ تھا وہ اس چہرے کے تمام خود خال واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

”غیر اس کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ ہو رہے۔ روزانہ جی خاصی صحت مند ہے۔ اس نے جو باتیں کہنے کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریض بنی ہے — یہ واقعہ کیا ہو سکتا ہے؟“ فریڈرک کو عام طور پر ایک ہی بیماری ہوتی ہے۔ عبت میں ناکامی کے بعد کئی نفسیاتی امین۔

”شاید اسے بھی — ہو سکتا ہے — جین ممکن ہے۔“

”راشد بیٹا! کیا معاملہ ہے؟“

اس نے تڑپ کر دائیں طرف دیکھا۔ اس کی اسی چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔
 "ای! ایکوں تکلیف کی آپ نے؟"

اس کی انہی نے زبان سے کوئی حفظ نہ کیا۔ پیالی اس کے ہاتھ میں دے دی۔
 "SERIOUS CASE" ہے؟

یہ سوال خلاف معمول کیا گیا تھا۔

"نہیں! انہی! کوئی ایسی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جانے گی۔"

کوئی عرصت ہے؟

راشد نے سر کے اشارے سے اس کو کہا۔

انہی وہیں کھڑی تھی۔

آپ آرام کریں! اتھوڑی دیر کے لئے شاید میں بھی سو جاؤں گا۔

وہ آہستہ آہستہ چائے پیارہ، کھڑکی کے میٹ ذور سے ٹکرتے، اس نے دھڑکنا دیکھا۔

ایک سیاہ بادل میں غائب ہو رہا تھا۔ ایک پھر وہی چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔ پیالی
 اس کے ہونٹوں کے قریب آئے تھے۔ رک گئی۔

وہ آدمی اس کی حالت بدلتے کے لئے کیلنک میں آئے گا۔ اس کا سر دھڑکتے رشتہ کیا
 ہے۔ وہ خاتون کو اس کی بڑی بہن ہے۔ اس نے خود ہی بتا دیا تھا۔۔۔

ہوا زیادہ تیز و تند ہو گئی تھی۔ کھڑکی کے میٹ ذور سے ٹکرا رہے تھے۔ اکٹھے
 دیکھا کہ کھڑکی کی طرف ایک ہاتھ بڑھ رہا ہے۔

"انہی! اسی تک۔ یہیں میں اور کھڑکی کے پت بند کر رہی ہیں۔ وہ ٹھنڈا سا ہو گیا۔"

چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھی۔ تو قریب قریب مائی ہو چکی تھی۔ اس سے پہلی پیالی
 پر دھڑکی۔ پاؤں پیٹنے اور کھڑا ہو گیا۔

"انہی!"

”تم آج کچھ ٹکڑے دو — ہاں یاد آیا، کتب کی ماں آئی تھی — یہ کہہ کر اس کی تلی نے
بچے کے چہرے کو تجسس نظروں سے ٹولا۔ مگر جس جذبے کی اسے تلاش تھی وہ نظر نہ آیا۔
”ٹھیک ہے اتنی؟“

”ماں نے ایک بار پھر بچے کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولی:
”وہ امید باندھے بیٹھی ہے۔“

”اتنی؟“ دانش لے دو تین لمبے ٹکڑے جو باندھ دینا میں کسی کسی امیدیں باندھی جاتی ہیں کہیں کسی
کو امید باندھنے سے روک سکتا ہے — نہیں — نہ آپ؟
”سوجھنا تو چاہیئے؟“

”صحیح میں گئے اتنی! وقت آنے پر یہ بھی جوہائے گما۔
”وقت کب آئے گا؟“

”نہ کیجیے کب آتا ہے۔“

ماں جلی گئی آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر دانش نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بائوس ہو کر گئی ہیں۔ اس
کا جی چاہتا تھا کہ ماں کو روک دے اور کہے اتنی! ابھی ٹھیکے کام کرنا ہے، مجھے شادی کی تیاری
میں کیوں جکڑتی ہو؟

مگر وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دروازہ بند ہو گیا اور وہ کرسی میں
خیمہ دراز ہو گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کے پٹنے چمک رہے تھے۔ مانی گاڑا اتنی دیر ہو گئی؟
وہ کرسی سے اٹھ بیٹھا، غور جانے کی پیرال نے وردان سے سے داخل ہو رہا تھا۔

”تیسری بار آیا ہوں صاحب جی؟“

”مجھے جگا دیا ہوتا بابا؟“

ماضی نے کھائی کی طرف دیکھا۔ سات بج گئے تھے۔ اس وقت تک قورہ ناشتہ کر کے
 اخبار بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس نے غنور سے چائے کی پیالے لے لی۔ چند گھونٹ لے کر دیر لگاؤ
 افی کیا کر رہی ہیں ؟

”جی صاحب جی! وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”ابھی آتا ہوں۔“

راشد باغ روڈ میں چلا گیا۔ اور جب ناشتے سے نارغ ہو کر کافی گرجا سے باہر
 نکلا تو آٹھ بجنے میں چھ سات منٹ باقی تھے۔ وہ گرمیوں میں آنکھ بچے کیلنگ پہنچ
 جاتا تھا۔

اس روز اخباروں کا مجرم کچھ زیادہ تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کچھ نذر
 و ہدایت دے رکھی تھی کہ اس کے پاس ایک مواد اس کے بعد ایک طے کر لیجئے۔ کوئی
 سیدنا نے سامنے منول پر تیشی تھی قورہ بے اختیار اس کی طرف دیکھتا تھا اور پھر جیسے
 اس سے ”جی کی کیفیت بدھنے لگا تھا۔

ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب کیلنگ مریضوں سے خالی ہو گیا تھا۔
 میں جناب! کیونٹہ کی آواز آئی۔

”دیکھو کوئی آیا ہے؟“

جی کوئی نہیں۔“

وہ کیلنگ سے نکل کر صحنے کی طرف جانے لگا جہاں وہ کھڑی تھی کھڑی کیا کرتا تھا۔
 اس نے موٹر پر جا کر کیلنگ کی طرف دیکھا۔ کیونٹہ مریضوں سے ہاتھ دھو رہا تھا۔

گھنٹ کی یہ بر ایک بوجھل خاموشی جاری تھی۔ اسی کی افی مریضوں کوئی نہ کوئی تھی۔ اسی
 ہاں تھی۔ اور اس کے بیٹے کو کھانا تھی۔ لہذا اس کی اس نے کوئی نہ کوئی نہ کوئی۔

افی! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟ اس نے پوچھا

”اللہ کا فضل ہے۔ ٹھیک ہے۔ آج میرا تجرم ناکام ہو گیا ہے ڈش خراب ہو گئی۔“

”تو آپ کی بجائے ڈش کی صحت خراب ہوئی؟ وہ اس پڑاواں سکرا نے لگی۔“

”راشد بیٹا! تجس مرضی اور صحت کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا۔“

راشد سمجھ گیا کہ انی کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس نے اگلے پن سے کہا:

”انی! آپ نے مجھے ڈاکٹر جو بنا دیا ہے۔۔۔ اس لئے میرا تعلق انجی اور میڈیسن سے ہے۔“

لوں بیٹا! ڈاکٹر کو دنیا میں کسی اور چیز سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ دوست کہتے ہو:

انی کے بچے میں ایک چھپا چھپا طرز تھا جسے راشد نے محسوس کر لیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب چار بجے تک وہ ناراض تھا۔ پوسے

دوبچ بجے تھے۔ دوبارہ کلینک میں جانے سے پہلے آرام کرنا ضروری تھا۔ وہ ہینک پر لیٹ

گیا۔ سو کر اٹھا۔ نہاد دھو کر چائے پی تو کلینک میں جانے کا وقت ہو چکا تھا۔

انی! جا رہا ہوں۔ اس نے سبوں کے مطابق ماں کو اطلاع دی اور اس کی ڈیوٹی ریمائی

دعاؤں کے سائے میں باہر نکلا۔ کلینک جاتے وقت اسے مریضوں ہی کا خیال ہوتا تھا۔ فیروزہ

کی حالت زیادہ خراب تو ہو گئی ہوگی۔ ناظر نے شوہر کو باقاعدگی سے دوا دی ہے یا نہیں۔

ایسی ہی باتیں اس کے ذہن میں ابھرتی اور دوڑتی رہتی تھیں۔ مگر اس دن صرف اس مریض

کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے گزشتہ رات اس نے پرانی انارکلی کے ایک مکان میں

دیکھا تھا۔

اسے اپنے ہر مریض سے ہمدردی ہو جاتی تھی۔ یہ اس کا شروع ہی سے رویہ تھا۔ اسے

اس نئی مریض سے بھی ہمدردی تھی لیکن اس ہمدردی میں ایک ایسا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا جو

ابھی تک اس کے لئے غیر مبہم تھا۔ جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اس شام بھی اس نے اس مریض کا انتظار کیا۔۔۔ وہ نہ آئی۔

آنکھیں پٹختے تھے۔ بیکنگ مریضوں سے خالی ہو گیا تھا۔ مگر سناٹا پائیے، انہی منتظر ہوں گی۔ اور یہی فیصلہ کر کے وہ کلاڑی میں بیٹھا لیکن یہ دیکھ کر اس حیرت ہوئی کہ اس کی کھڑی پرانی انارکلی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

”یقین بازار میں دینے کے بلوچو کھڑکی میں سے نہ کوئی چہرہ جھانکنا اور نہ کوئی بچے آیا۔ چڑھی بازار میں دیا تو وہی شخص پہنچے آیا جو اسے اس گھر میں لے کر آیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب: اس کے لیے سے بڑی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

”میں نے سوچا آپ نے مریض کی حالت نہیں بتائی، زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو؟

”بڑی تکلیف کی ڈاکٹر صاحب: آپ نے؟

بیڑیاں ملے کرتے ہوئے راشد بیٹھ گیا اور پوچھا:

”وہ پلائی تھی؟“

”میری بیوی نے پلائی ہوگی، میں بازار سے لے آیا تھا۔“

مریض کی بڑی بہن نے خیر مقدم کیا۔

”میں نہیں گیا تو ڈاکٹر صاحب خود ناظرہ کو دیکھنے کے لئے آگئے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب: آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بڑی تکلیف فرمائی، شریف دیکھیے۔

خاتون نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ راشد بیٹھ گیا اس نے ادھر ادھر دیکھا

”وہ نظر نہیں آ رہی۔“

”جی وہ انہی پر ہے اپنے کمرے میں۔ میں اس نے ایک انجینیری بنا رکھی ہے۔ زیادہ

وقت وہیں گزارتی ہے۔ پلائی ہوئی۔“

خاتون دائیں طرف پردے کے پیچھے بیٹھی تھی۔

”ابھی نہیں، راشد نے اسے واپس بلاتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے مجھے کچھ پوچھنا ہے۔ اگر آپ حاضر نہیں تو مجھے اپنی بہن کی کیس سسڑی بتائیے۔“

میرا مطلب ہے یہ بتانے کو کب سے اس کی ایسی حالت ہو گئی ہے۔ اس کا مرض شاید نفسیاتی ہے۔ بظاہر سندھت معلوم ہوتی ہے؟

راشد نے دیکھا کہ خاتون کے چہرے پر ایسے تاثرات پھیل گئے ہیں جو اس کے دل پہلے کب کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ مردہ جو راشد کے پاس کھڑا تھا وہ دواؤں کی طرف جہلے لگا۔
ڈاکٹر صاحب: آپ اس کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکتے؟
میں جہانی مرض کی تشخیص کر سکتا ہوں؟

کیا اس کا مرض جہانی نہیں؟ — نہیں ہو گا — آپ ہیتر جانتے ہیں؟
وہ «سری کری» پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کے کب تک اثرات شاید گہرے ہو گئے تھے یا راشد نے ایسا محسوس کیا تھا۔

کئی رات جب آپ کو زحمت دی اس کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ سانس لینے لگی تھی چھت کو ٹھنکی باندھ کر دیکھے لگی تھی۔ میں دے گئی، آپ نے جو دوا دی اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی بے چینی کم ہو گئی۔
کیا ممکن ہے کہ بے چینی خود کر آئے یا راشد نے بوجھا۔
وہ خاموش رہی۔

ڈاکٹر صاحب: آپ نے درست کہا ہے اس کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ ہو چکا ہے جس سے وہ نفسیاتی مریض بن گئی ہے؟
کیا ہے وہ حادثہ؟

وہ سر جھکا کر کڑی کے بازو پر دستہ پھیرنے لگی۔ راشد اس کی طرف ٹھنکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ شاید وہ اپنی بہن کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے متغذیب ہے اس نے دو چار لمحے انتظار کیا، پھر بولا:

میں ڈاکٹر ہوں، آپ کی بہن کا علاج کرنا چاہتا ہوں؟

”میں سمجھتی ہوں۔ مگر ناخروہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ اس کی مدد و مددگاری کو سنا جائے۔ وہ ادھر رہے۔ مجھے حذر ہے کہ جلد ہی بچے نہ آجائے۔ بڑا لے گی۔ اور کچھ نہیں کہے گی۔ تو ناز و قطار دونوں ہی شروع کر دے گی۔ ویسا دوسرے ہو چکا ہے ہمارے ایک عزیز حکیم صاحب ہیں وہ آیا کرتے تھے۔ دو سال ہوئے کراچی چلے گئے ہیں۔“

”وہ کچھ نہیں کر سکے؟“ راشد نے پوچھا۔

”جی نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ بہر حال آپ نیسے، ہم دیر میں ہیں، بھال کوئی نہیں۔ میرا نام نامہ ہے اور اس کا نام تو آپ نن ہی پکے ہیں۔ میری عمر چودہ برس اور ناخروہ کی سات برس کی تھی کہ جب ہمارے آبا جی دنیا سے چلے گئے تھے۔ آبا جی کے انتقال کے چھ سال بعد اُمّی بھی رحلت ہو گئیں۔ میری شگنی اُمّی اپنی زندگی میں کراچی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے ایک برس بعد میری شادی مسعود سے ہو گئی جو ہمارا دور کا رشتہ دار ہے اس کے سارے رشتہ دار عزیز کراچی میں ہیں اور میں ناخروہ کو کسی کے حملے کے جانیں سکتی تھی اور ناخروہ اپنا گھر چھوڑنے پر رضامند نہیں تھی، اس نے مسعود میں رہنے لگا۔

ناخروہ کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے اور اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ اس نے اس کے لئے راشد کو اس کی طرف جھکا پڑا تھا۔

”مجھے اپنی بہن سے عید عبت ہے۔ شروع شروع میں مسعود سے پسند نہیں کرتا تھا بلکہ طوفاً اس سے شاکہ کرتا تھا کہ وہ ناخروہ بہت اچھے اخلاق کی لڑکی ہے مگر کبھی کبھی ضدی بھی ہو جاتی ہے۔ اس وقت کسی کی نہیں سنتی۔ جب وہ حادثہ ہوا تو مسعود کا رویہ بدل گیا اور وہ اس سے اچھا سلوک کرنے لگا۔“

”ناخروہ کا گھر ہے؟ ہمارا فرض تھا۔ ریاض مسعود کا دوست تھا اور اس کے دفتر میں ہی کام کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ سے رشتے کی بات چیت ہوئے گی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناخروہ ریاض کی دہلیز میں آگئی اور اپنے نئے گھر میں چلی گئی۔“

”میں نے خد کا شکر ادا کیا کہ ذمے داری پوری ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی میں فراموشی
مطلوبت پیدا ہو گئی تھی، اور یہ خوشگوار زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ مگر ابھی دو سال بھی
نہیں گزرے تھے کہ ناخوہ اور اس کے شوہر میں کشمکش کی رہنے لگی۔

”میں سمجھتی تھی کہ کشمکش معمولی قسم کی ہے وہ دو ہوجائے گی خاص طور پر اس حالت میں کہ
ناخوہ ماں بننے والی تھی۔ لیکن میرا خیال درست نہ نکلا۔ ایک روز میں اس کے یہاں گئی تو وہ
اپنے گھر سے میں کسی طرح انہیں رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی برس چڑی باہی! آپ انہیں سمجھاں کیوں
جس۔ ہر وقت دوستوں میں گھرے رہتے ہیں، گھر کی ذرا پردائیں کرتے۔ میرا کوئی خیال
نہیں کرتے:

میں نے کہا، ناخوہ! بات کیا ہے؟

ریاض وہیں تھامین پر بیٹھا تھا۔ بروا آیا، میں بتا رہی ہوں بات کیا ہے وہ جا رہی ہے کہ میں
ہر وقت گھر میں بیٹھا رہوں، ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہ جاؤں۔ میں نے شادی کی ہے
اپنے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈھلائی:

ناخوہ کہتی تھی کہ وہ آدمی آدمی رات تک دوستوں کے پاس رہتا ہے اور ریاضی گھر سے
باہر رہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

میں نے بہن کو کھپکھا کہ بچہ ہو جانے کا تو تہہ سے شوہر کی گھر سے دلچسپی خود بخود بڑھنے لگے
گی۔ میرے کام کو۔ آنے والے وقت کا انتظار کرو۔

یہ اسی بڑی کشمکش کی ابتدا تھی جس نے دونوں کی زندگیوں میں زہر گھول دیا اور وہ ایک
”دوسرے سے بیزار رہنے لگے۔

”بچہ ہوا اور یوں نکلا جیسے حالات سدھر جائیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں
کا نشان ختم ہو جائے گا۔ — بلکہ میری توقع پوری ہو رہی تھی — سلیم نے اپنے ماں باپ کو
ایک بار پھر ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا — مگر طحان جسے میں سمجھتی تھی کہ ختم ہو گیا ہے۔

ختم نہیں ہوا تھا صرف ختم کیا تھا:

نامرہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی وہ ماسنے پردے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے اوپر ہانے کے ۷ میڑھیاں تھیں۔ پردے کا شاید جنبش ہوئی تھی یا ممرہ نے یہ محسوس کیا وہ کہنے لگی۔
 "بیمہ ایک سال کا ہو گیا تھا۔ دونوں کو اپنے اپنے سے بے پناہ محبت تھی۔ دونوں اسے دیکھ کر محبت کر جیتے تھے۔ مگر ناخوار یہ بات برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی کہ اس کا شوہر تین بار گھٹنے اپنے روتوں میں گزارے اور کبھی کبھی رات کو بھی دیر سے آئے۔ اور یہی طرف ریاض بھی اپنی برسوں کی عادت چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

"ایک رات وہ بڑی دیر سے آیا ناخوار نے کمرے کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا اور جھپٹا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔"

دروازہ کھلا تو ان میں سخت لڑائی ہوئی۔ ناخوار نے کہہ دیا کہ اگر وہ اپنی عادت نہیں چھوڑتا تو وہ اس کے گھر میں نہیں رہے گی۔ اور ریاض کی انا بھی کسی طرح شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔

ریاض کے گھر والوں نے دونوں کو بھانے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ ناخوار صبح ہوتے ہی اپنی طرف سے شوہر کا ٹھکرہ پیشہ کے لئے جھٹ کر ہمارے پہلی آگئی۔
 ناخوار انھی میڑھیوں والے پردے کی طرف گئی اور دوسرے لمحے واپس آگئی۔

"صاف کیجئے۔ میں اپنی بہن کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ ناخوار بچے کو لے کر دھڑلانی حالات اس قدر ناخوشگوار اور تلخ ہو گئے تھے کہ وہ ریاض کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ میں اس سے کہتی تھی کہ ناخوار یہ بہن کا گھر ہے۔ تمہارا گھر وہی ہے جہاں تمہارا شوہر رہتا ہے۔ آخر تمہیں وہیں جانا ہے۔ کل کی بجائے آج ہی کہیں نہ پہلی جاؤ۔ اگر وہ یہی بات سن کر بھینٹا جاتی تھی اور کہنے لگتی تھی باہی! اگر تمہیں میرا یہاں رہنا ناخوار ہے تو میں کہیں اور پہلی جاتی ہوں۔ کوئی نہ کوئی چھت مجھے پناہ دے ہی دے گی۔ میں

اس سے لپٹ جاتی۔ ایسا مت کہو ناخ، یہ چھت قبائے ہی گھر کی چھت ہے جس کے سائے میں تمہاری بڑھی ہو۔ لیکن میری بہن! شادی کے بعد لڑکی کا گھر یکے کا نہیں منسلک کا گھر ہوتا ہے۔ نامہ نے ایک لہجہ میں بھری میری بہن نے اپنی ضد چھوڑی اور دیاغی نے اپنی ما کی پیار دیواری سے باہر نکلنا پسند کیا۔ دن گزرتے گئے۔ انھا سلیم بیاد ہو گیا۔ میں نے بہن سے برست کہا، جس طرح سلیم تمہارا بیٹا ہے وہ باغی کا بھی ہے؟

”تو میں کیا کہوں؟ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

”اے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا بچہ پیار ہے۔“

”تو کیا میں پیار بچے کو گود میں لے کر بے غیرت بن کر اس کے صدانے پر دنگ دوں کہ اس کا علاج کرواؤں کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے لئے دوا دارو کا انتظام کرنا مشکل ہے۔

”باقی! کہیے آپ کی کیا یہی منشا ہے؟

”نہیں، میری یہ منشا نہیں ہے۔“

”آپ کی جو منشا ہو مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ میں اپنی ساری چیزیں بیچ دوں گی، اپنے بچے کا علاج کرواؤں گی۔

میں نے سمجھ لیا کہ اس موضوع پر گفتگو سے گئی بڑھ جانے گی، خاموش ہو گئی۔

ریاض کو بچے کی علامات کی خبر مل گئی۔ وہ آیا۔ مجھے توقع تھی کہ اس موقع پر دونوں کے دل صاف ہو جائیں گے۔ وہ بچے کو اپنے گھر لے جاتا جاتا تھا مگر اس کا باقاعدہ علاج ہو سکے۔ مگر ناظرہ اس کے لئے تیار نہیں تھی۔

دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔ ریاض ذرا نرم پڑ جانا، اگر ناظرہ ذرا تحمل سے کام لیتی۔ لیکن وہ تحمل کے اظہار سے باز رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض ایک ڈاکٹر کو ملے گیا۔ اس نے نسخہ لکھا۔ ریاض دواؤں خرید کر لے آیا۔ وہ اس وقت بھی کہنا تھا کہ یہاں بچے کو باقاعدگی کے ساتھ دوا دینا ممکن نہیں ہو گا۔ مگر ناظرہ نے اس کی ایک نہ تھی۔ چنانچہ وہ سخت ناامنی پر

چلا گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ آئندہ اس گھر میں نہیں آئے گا۔

”میرے لئے یہ صورت حال بڑی اذیت ناک تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھی۔ بے بس تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ بچے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ناخوہ اس کے لئے وہ سب کچھ کرتی تھی جو اس اپنے بچے کے لئے کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی صحت گرتی ہی گئی۔“

جسٹس جیٹاؤشڈ راجا جیٹاؤشڈ اس کا جنازہ لڑ گیا ہے اور وہ شام آٹھ بجی اس نے میری بہن سے ملادی خورشید چھین لیں۔ یہ غلام عام شاموں سے مختلف تھی تیز رفتاری کے تھوڑے جلد سے تھے۔ اندھیرا بخیر سے فضاوں میں کھینچے لگا تھا ناخوہ اور ابے کمرے میں تھی پکا ایک اس کی جوانی ہوئی آواز باقی کہتے ہوئے سنائی دی۔

میں اور بچہ۔ ناخوہ لڑش پر بے ہوش پڑی تھی اس کے سر سے ہوا بہہ رہا تھا اور مسیم ینگ پر بے حس دھکت پڑا تھا۔

بچے کو مرنے دیکھ کر گھر کو وہ بچے آنا چاہتی تھی کہ وہ اس سے ملے مگر انہوں نے پڑی تھی اور اس کا سر ہیٹ گیا تھا۔ میں نے اور میرے شوہر نے ناخوہ کو سنا۔ اس کے سر کے زخم پر پٹی باندھی تھیں اس کے دل پر جو زخم ٹپ چکا تھا اس پر پٹی باندھنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ ریاض آیا اور بچے کو اٹھاتے ہی پلا گیا۔ بچے کی زندگی ان دونوں کو قریب۔ مکی موت۔ میری بہن اس سے دشمنی کے بدکھوئی کھوئی۔ بچی تھی جس طرف دیکھتی تھی دیکھتی ہی چلی جاتی تھی۔

آخر سال میں تک رہنا تو حالات زیادہ نہیں بگڑ سکتے تھے۔ ریاض کیسے چھوڑا اور میں نے ماں جاتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ناخوہ کو حلاق کا کاغذ بھیج دیا۔ یہی آئی اس کے خاتمہ پر تھی۔

نور کٹر صاحب، میری بہن کچھ انبار مل ہو گئی ہے۔۔۔ اس کے شب و روز کا عرف ایک ہی صوف ہے اور وہ ہے کتاؤں کا سلاخو۔۔۔ نئی نئی کتاؤں خرید کر مالتی رہتی ہے اور

سے باز ہے۔ نامرہ نے اس کے چہرے سے ملی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔

”ڈاکٹر صاحب! آئیے بیٹھ جلیے۔ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بہت قیمتی وقت ہے آپ کا۔ اور نامرہ وہیں آنے لگی۔ راشد بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔“

”میرا ایک دوست ہے، واقعی امراض کا معالج میرا خیال ہے۔“

راشد فقرہ مکمل کر سکا۔ نامرہ غصے میں اپنا سر ہلانے لگی۔

”افسان کو ہر طرح کی کشش کرنی چاہیے۔“

نامرہ جاتے لگی نہیں ڈاکٹر صاحب! نامرہ کا تھکی جواب تھا

”میں ڈاکٹر سے وقت مقرر کر لوں گا۔ اس وقت آؤں گا۔“

ڈاکٹر صاحب! آپ بڑی تکلیف کر رہے ہیں۔ آپ۔۔۔ نامرہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے جذبات کا کس طرح اظہار کرے!

”نامرہ! اگر میرے تکلیف کرنے سے کسی کی حالت مدہم جائے تو میں اسے تکلیف نہیں سمجھوں گا۔“

راشد نیچے اتر گیا۔

وہ کبھی دیر سے گھر آتا تھا تو اس سے تاخیر کی وجہ نہیں پوچھتی تھی صرف یہ پوچھتی تھی

”راشد بیٹا! مریض کی حالت ابھی ہے؟ وہ کب صحت پائی گی؟ اس کا بیٹا ضرور کسی مریض کے گھر

سے آرہا ہے۔“ اس نے یہی سوال کیا۔

”فضیلتی بیمار ہے۔“

”کیوں؟“

”اس کی زندگی میں ایک حادثہ ہوا ہے۔۔۔ جگہ دو حادثے ہوئے ہیں۔۔۔“

تیس برس کی لڑکی ہے۔

”اللہ رحم کرے۔۔۔“ اور وہ کھانا لانے کے لئے باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔
 سونے سے پہلے اس نے ماں کو ناخن کی ساری دودھ اور سناہ کی اور وہ اس کی صحت کے
 لئے دھار کے سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

راشد کے علاج میں دوا تین بار یہ سوال اُبھرا اگر وہ جانے کے لئے آمادہ نہ ہوئی تو۔
 اس سے وہ پریشان ہو جاتا تھا۔۔۔ مگر دوسرے روز کلینک میں جا کر اس نے سب سے
 پہلا کام یہ کیا کہ ڈاکٹر لطیف کو بلایا اور اس سے تین بجے کا وقت مقرر کر لیا۔

کلینک سے ناراض ہوا تو بونا ایک بچہ چکا تھا۔ سواد بچے وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو
 ماں نے پوچھا،
 ”خیر تو ہے بیٹا؟“

”ای۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ اس بچی کو ڈاکٹر لطیف کے پاس لے جانا ہے؟“
 وہ انہماک میں سر ہلکے لگی بیٹا تھا۔
 مسعود ماں کی پہلی آواز پر ہی نیچے آ گیا۔
 راشد گاڑی سے نکلے گا۔

ڈاکٹر صاحب: وہ نہیں جانے گی۔ بڑی ہندی رنگ ہے بہن نے بات کی تھی تو وہ زور
 زور سے سونے لگی تھی۔

”چلیے تو سی، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“

راشد مسعود کے ساتھ اوپر آ گیا، نامہ روز سے پرکھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مایوسی دکھائی
 دیتا تھا۔ اس مایوسی کے حال میں وہ راشد کا غیر متقدم بھی نہ کر سکی۔ وہیں کھڑی رہی۔
 کہاں ہے؟ راشد نے پوچھا۔

نامہ روز نے سر کے اشارے سے کہہ دیا: اوپر ہے۔

”نیچے نہیں آئے گی؟“

”اس لئے تو آج کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں نے صرف یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے پس گھڑ گئی۔ امد کہنے لگی میرے ساتھ یہ مذاق کرنا چھوڑیں :

”کوئی بات نہیں، میں ادھر چلتا ہوں :

راشد پر اسے کی طرف جانے لگا۔ مسعود نے تیری سے جا کر پرہہ بٹا دیا۔ چند میز میوں کے بعد راشد اور نامہرہ غاخرہ کے کمرے میں تھے۔

کمرہ خنجر تھا فریچ بھی خنجر تھا۔ گروہات مستعد معلوم ہو رہی تھی کہ غاخرہ نے سامان رکھنے اور کتابوں کو ترتیب کے ساتھ سجانے میں ہلکے اچھے اور صاف ستھرتے ذوق کا بصورت وایت نہیں بھی یہ آئندگی اور انتشار کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

جب راشد اور نامہرہ کمرے میں پہنچے تو وہ ڈرائی میں دھنسی میں کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ راشد کو اپنے کمرے میں فریچہ کو تیراں رہ لگئی۔ لڑکی سے اٹھ کر چلی۔ راشد کے مطالب ہو کر کہنے لگا :

”معاف رکھئے، آپ کے محلے میں وائٹ کی بے صحت کر رہا ہے۔“
 ”تو نہ وہ در تیں لٹھے خاموش رہنے کے بعد بولی :

”فرمائیے :

فرمانا دانا کیا ہے غاخرہ : ”بھلا ہے وہی میں دید کے ساتھ آیا ہوں تو تم پر ہی مددوں۔“
 غاخرہ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر جلدی سے آنکھیں جھپکائیں۔
 ”بھلا یہ ہے کہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ ذرا بے وقوف ہے۔“
 راشد مسکراتے لگا۔

”یہ لڑکی اپنی بڑائی اور بھلائی سے بے نیاز ہے۔ میں چاہتا ہوں تم پر ہی مدد کرو۔“

غلام بڑی سنجیدہ سی گھر رشہ کے یہ الفاظ اس کے سکرا اٹھی ۔

”خداوں! اسے ذرا ابا ہرے جانا ہے ڈاکٹر کے پاس۔ اس میں اس کی اپنی بھلائی ہے“

ناخروہ! کیا تم میری مدد نہیں کرو گی۔ مجھے ایس کر دے گی؟

ناخروہ کا سر جھٹکا ہوا تھا۔ راشد اور ناصرہ۔۔۔ دونوں اس کے جواب کا انتظار کر رہے

تھے۔ اس نے سر فزا اٹھایا اور کب تک بچے میں بول:

”یہ سب فضول ہے۔ بے سود ہے۔ کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ نہیں ہو سکتا؟“

راشد اس کے اور قریب ہو گیا۔

”تم دوست کہتی ہو۔۔۔ مگر مستقبل کے متعلق کوئی شخص کوئی بات بھی دشمن سے نہیں

کہہ سکتا۔ انسان کو بہر حال بہتری کی توقع رکھنی چاہیے۔ میں نے دوست کہا ہے نا؟“

ناخروہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اب مکمل باندھکتا ہوں کے ایک ایک کدو دیکھ رہی تھی۔

”چلو ناخروہ؟“

”چلیے، آتی ہوں؟“

ناصرہ کو یہ الفاظ سن کر اتنی حیرت ہوئی کہ وہ راشد کے لئے دو لڑکے کا ہاتھ بھی نہ بٹاتا۔ یہ کام راشد نے خود کیا۔

راشد کو گلہڑی میں بیٹھے چھ سات منٹ گزرے ہوں۔ کتے، بکریاں، آگئیں، ناخروہ نے لباس بدل لیا تھا۔

”شکریہ! مجھے یہ امید تھی کہ یہ کہہ کر راشد نے گلہڑی کا پھلادو روازہ کھول دیا۔ دونوں بھینس اذد بٹھ گئیں۔ راستے میں خاموشی رہی یہاں تک کہ گلہڑی ڈیڑھ دوڑ کی ایک کوشش کے پورے میں جا کر گئی۔

راشد نے گلہڑی کا دوا روازہ کھول دیا، پھر کالی ریل پر انگلی رکھ دی۔ ملازم نے انہیں ایک کمرے میں بٹھا دیا، ڈاکٹر لطیف آیا۔ سن پچاس سے اوپر چہرے پر ملاطمت، آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک۔

تینوں کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر لطیف نے پہلی ہی نظر میں بجانب لیا کو مریضہ کن ہے۔ وہ ناخروہ سے مخاطب ہوا۔

”بھئی! آپ کا نام ناخروہ ہے شاید۔“

ناخروہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”قرآپ آئیے ذرا میرے ساتھ۔“

ناخروہ سوالیہ نظروں سے بہن کو دیکھنے لگی۔

ناخروہ کے ذہن میں کوئی بات نہ آئی۔ جب دو تین لمبے گز دھڑلے قوراشد نے ناخروہ سے مخاطب ہو کر کہا:

”یہ ڈاکٹر ہیں۔ اور بڑے عمدہ انسان ہیں۔“

ناخروہ اٹھ بڑھی اور ڈاکٹر لطیف کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

”ڈاکٹر صاحب کیا پوچھیں گے؟ ناخروہ نے سوال کیا۔“

”جو مناسب سمجھیں گے پوچھیں گے، جو کچھ ہو گا بہتر ہو گا۔“

ناخروہ محض فکر نہیں آتی تھی۔ تاہم وہ خاموش ہوئی تو ہر ایک کو وہ منٹ کے بعد وہاں کی طرف دیکھتی تھی۔

ڈاکٹر لطیف کا نوکر چائے کی ٹرالی لے کر آ گیا اور ٹرالی کے قریب روک کر چائے

پانے لگا۔ جب چائے پی گئی، ڈاکٹر لطیف اور ناخروہ آ گئے۔

”ڈاکٹر راشد صاحب، ناخروہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ ماشاء اللہ بڑی ذہین،

مصلحت۔ ڈاکٹر لطیف نے ناخروہ کو بہن کے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

راشد نے مسکرا کر جواب دیا۔

”میں آپ کی تائید کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب!“

ناخروہ بڑی طرح حیرت مندی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔ وہ بہن کے کچے پیچھے ہٹا۔

”چلئے ڈاکٹر لطیف نے ناخروہ سے پوچھا۔

”جی نہیں، میں چلئے نہیں بیروں گی۔“

”نہیں جی چاہتا تو نہ ہی۔ ہاں ڈاکٹر صاحب! ناخروہ کو ابھی لانا ہو گا۔ آج کا کام ختم بہتر: راشد لے گیا۔“

ناخروہ گاڑی میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے وہ اپنے دل پر ایک بوجھ ماحسوس کر رہی ہے۔ سارا راستہ وہ اس طرح گم غم بیٹھی رہی۔

دوسرے روز بھی راشد ناموہ اور ناخروہ ڈاکٹر لطیف کے ہاں وقت مقررہ پہنچ گئے۔ یہ نشست پندرہ منٹ تک رہی، تیسرے روز بھی ناخروہ کو جانا تھا۔ ناموہ تیار ہو رہی تھی کہ گھر میں مہمان آ گئے۔

”ڈاکٹر صاحب! کل جائیں گے آج نہیں۔“ ناموہ نے معذرت خوارم نہ لیجے میں کہا۔

”ناخروہ تو نہیں ہرنا چاہیئے۔“

”پھر؟“

”میں لے جاؤں گا۔“

”اتنی تکلیف کریں گے؟“

”روزہ کر نہیں رہا۔“

راشد نے ناخروہ کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر لطیف کے ہاں لے گیا۔ وہ کمرے میں بیٹھا چلئے پی ر لم تھا کہ ڈاکٹر لطیف آ گیا۔

”ڈاکٹر صاحب؟“

”کیسے؟“

”یہ ٹکی ناخروہ آپ کی کوئی عزیزہ تو نہیں، جیسا کہ آپ نے ٹیلیفون پر بتایا تھا۔ میری حال آپ اسے اپنے ساتھ لائے ہیں، میں اس سے جو کچھ تو کچھ سکا ہوں اس سے میں ایک نتیجہ پر

”بچ گیا ہوں۔۔۔ لڑکی محرومی کا بڑی طرح شکار ہو چکی ہے۔ یہ محرومی دور ہونی چاہیے:

”کس طرح ڈاکٹر لطیف صاحب؟

”اس کی نگہ میں بچہ ہونا چاہیے۔۔۔ یہی اس کا طبیاتی علاج ہے:

راشد سوچ میں پڑ گیا۔

”بد قسمتی سے اسے طلاق مل چکی ہے۔۔۔ ہمارے معاشرے میں مسئلہ عورت کی شادی ایک بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہے: راشد نے اس معاملے کی پیچیدگی واضح کرتے ہوئے کہا۔

”علاج ایس ہی ہے: ڈاکٹر لطیف نے تھی محروم پر کمر دیا۔

”اچھا ڈاکٹر صاحب: میں ذاتی طور سے آپ کا بچہ ممنون ہوں: راشد نے ممنونیت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

”چھوڑ دینے ڈاکٹر صاحب: اس FORMALITY کی کیا ضرورت ہے۔۔۔

ناخروہ و دراز سے سے اندر داخل ہو چکی تھی۔

”چلو ناخروہ! راشد اس کی طرف جانے لگا۔

وہ اس کے پہلو میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ نگاہی کدھر۔۔۔ ہاں ہی تھی۔ یہ بات ناخروہ کو معلوم نہیں تھی۔ جب وہ لڑکی قراں نے سراٹھایا۔ اس کے سامنے نور، نور ملک، حضرت کھڑے تھے چھوٹوں کے پسے تھے نور کوئی مکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”یہ کہاں لے آئے ہیں ڈاکٹر صاحب؟ یہ سوال ناخروہ کے ہونٹوں پر آئے آئے رک گیا۔

راشد نے اپنی جگہ سے اتر کر دوسری طرف جا کر نگاہی کا دوازہ کھولا۔ ناخروہ نیچے اتر گئی۔

”شاید تم حیران ہو کہ میں تمہیں گھر میں پہنچانے کے بجائے باغ جناح میں کیوں لے گیا ہوں:

”شاید نہیں یقیناً:

یری مراد یقیناً ہی سے تھی: راشد نے سسکا کر کہا: آؤ ذرا ادھر بیٹیں: اور راشد ناخروہ کو ایک

ناداب جگہ پر لے آیا اور بیٹھ گیا۔ ناخروہ کھڑی رہی: بیٹھ جائے اور وہ نہ گئی۔۔۔ بچہ پر۔۔۔

اس سے کچھ دور۔

”فاخرہ! میں ایک سوال کرنا چاہتا تھا:

”جی۔“

”ذرا یہ بتاؤ تمہارے خیال میں میں کیسا آدمی ہوں؟“

اس عجیب سوال پر فاخرہ نے چونک کر دانش کو دیکھا۔

”جواب دو۔“

”آپ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے۔۔۔ یعنی فرشتے ہیں۔“

”نہیں بھئی نہیں، میں تم سے شوق نہیں ہوں۔ میں فرشتہ نہیں انسان ہوں اور انسان ہی دہنا

چاہتا ہوں، تم مجھے انسان یا زیادہ سے زیادہ ایک اچھا انسان کہہ سکتی ہو۔۔۔ اگر پسند نہ تو۔۔۔

کیا یہ پسند کرتی ہو؟“

”ہوں۔“

”مگر یا میں ایک اچھا انسان ہوں۔۔۔ فاخرہ! کیا تم اس اچھے انسان کا ساتھ دو گی؟“

”جی؟“ فاخرہ کے چہرے پر حیرت و استعجاب کا تاثر پھیل گیا اور پھر یہ تاثر خرم و حیا کی
مرخی میں ڈوب گیا۔

”اسی سوال کا جواب سننے کے لئے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔“

فاخرہ کو یہ تواضع سے آتی ہوئی غصہ ہوئی۔ اسے لگا جیسے یہ تواضع اس کے ایک تیز جھوٹے

ہنسی ہوئی آتی ہے اور دوسرے ہی لمحے میں جھوٹا ککس دور نکل گیا ہے۔ وہ سانسے ایک پارے
کو دیکھ رہی تھی جس کی پنہلوں بھری شاخیں ہلکا رہی تھیں۔

”مجھے جواب دو فاخرہ! ہاشم کی تواضع اس کے کانوں میں گونجی۔ اچانک اس کی نظریں پورے

سے ہٹ کر اس پر پڑیں۔ وہ بڑے غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے ایک کیوں سوچا؟“

”اس لئے سوچا کہ تیریں میں بہت پسند کرتا ہوں۔“

”آپ جانتے ہیں کہ۔۔۔“ ناخوہ غصہ مکمل ذکر ہو گیا۔

”میں سب کچھ جانتا ہوں ناظرہ! اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری زندگی بڑھ سکتی ہوگی۔ ہم خوش رہیں گے۔“

”ڈاکٹر صاحب! ناخوہ کچھ مضطرب ہو گئی تھی، باہمی پریشان ہوں گی۔“

”یہاں سے بیدھا گھر جائیں گے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پیشتر میں نے

جرات سوچی ہے اس کے بارے میں تمہاری رائے معلوم کر لوں۔“

”میں۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ کہوں؟“

”ٹھیک ہی تمہنے جواب دے دیا ہے۔“ راشد کے چہرے پر مسکراہٹ کی لہریں

پھیل گئی تھیں۔ چلنے کی میز پر راشد کی اتنی ناراض ہو گئی تھی مگر راشد ایک گھونٹ کے بعد مدد تین لمحے توقف کرتا تھا پھر پیالی دوبارہ جو تھوں تک لے جاتا تھا اس میں چار بار لکھنویوں سے اسے دیکھ چکی تھی بیٹے کا یہ انداز اس کے لئے خلاف معمول تھا۔

پیالی شاید نصف کے قریب ہی خالی ہوئی تھی کہ راشد نے اسے میز کے اوپر رکھ دیا۔ لیکن اسے منہ پر پتھرا، اس اس وقت بھی اسے لکھنویوں سے دیکھ رہی تھی۔

”راشد بیٹا!“

”کیسے اتنی؟“

”کیا ہوا تمہارے اس کیس کا، وہ نا۔۔۔ نفیاتی کیس۔“

راشد بے خیالی میں دوبارہ منہ پر پتھرا لگا۔

”وہ۔۔۔ ٹھیک ہے، ڈاکٹر لطیف نے اپنا شدہ دے دیا ہے۔“

وہ اپنی نگرانی سے اٹھ بیٹھا۔ اس سے پہلے اٹھ بیٹھی تھی مگر اس روز بیٹھی رہی۔

”اسی!“

”کہو۔“

”مجھے کچھ آپ سے کہنا ہے۔“

”میں جانتی تھی آج میرے بیٹے کو جھوٹے کوئی بات کہی ہے، انتظار کر رہی تھی۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟“

”بیٹا! بعض باتیں بغیر کسی خاص وجہ کے معلوم ہو جاتی ہیں۔ بیٹھ جاؤ، اطمینان سے کہو۔“
 لاشعریٹھ گیا۔

”اتنی! میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”اتنی نے لڑکی پر پہلو بدلا۔“

”کس لڑکی سے بیٹا؟“

”فاخرہ سے۔“

”فاخرہ۔۔۔ یہ وہی لڑکی تو نہیں جو نفیاتی۔۔۔“

”جی اتنی!“

”اتنی اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر پھیرنے لگی۔“

”اتنی! اس کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی دلیل ہے۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ

میں ایسا چاہتا ہوں، اس میں میری خوشی ہے۔“

”بڑھی آنکھیں جو زندگی کے بے شمار رنگ دیکھ چکی تھیں اپنے بیٹے کا ایک ایسا رنگ

دیکھ رہی تھیں جو اس کی توقع کے خلاف تھا لیکن اس کا کہن سالہ تجربہ بتا رہا تھا کہ بیٹے کے

اس رنگ کے چھپے اس کے دل کا عزم اور قوی ارادہ کا دفرما ہے۔ ہلکی

”نورتم نے اپنی رفیقہ حیات کا انتخاب کر لیا ہے!“

”جی اتنی!“

”میں یہ نہیں پرچھوں گی کہ تم نے اس لڑکی میں جو عقل و تہا رہے اپنے ایک نفسیاتی مرعینے

ہے کیا خوبیاں دیکھی ہیں۔ تم کہیں اس کی ذات سے متاثر ہو گئے ہو۔ ماشاء اللہ عقلتے ہو۔
اپنی بھلائی بڑائی خوب سمجھ سکتے ہو۔ فقط ایک سوال کروں گی۔ میں کوکب کی ماں کو کیا جواب
دلائی؟

”ماں نے وہی سوال پوچھ لیا تھا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ اس نے دیکھتی دگ پر ہاتھ
رکھ دیا تھا۔

”یہ نہیں اتنی! کو میں نے اس پر غور نہ کیا ہو۔ خود کیا ہے۔ مگر دیکھئے ناکو کب کا بڑا
خوشحال گھراٹا ہے شادی ایسے گھرانے میں کوئی پرہیز نہیں بن سکتی۔
”کچھ جذباتی باتیں بھی ہوتی ہیں، بیشا! عدالت ہر مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔
”جذباتی باتیں تو۔۔۔ اتنی! جذباتی باتیں کیا ہوں گی۔“ اس نے اپنی طرف سے
ندامت بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں تم نے ان پر غور نہیں کیا ہو گا۔ بہر حال میرے لئے یہی دلیل کافی
ہے کہ اس میں میرے بیٹے کی خوشی ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔ ٹھیک ہے۔“
راشد کی نظر روادی کھاک پر پڑی۔ پونے نو سو چکے تھے۔ ابھی اسے لباس پہنا ہے۔ وہ
اوپر چلنے لگا۔ ان دہریں مٹھی رہی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد نیچے آیا اور بولا۔
”اتنی! آپ بات کریں گی دلاس۔ یعنی۔۔۔ خاخرہ کے گھر جا کر۔“
”یہ بات بھی تمہیں کہنا چاہیئے تھی؟“
راشد کچھ عجرب ہر گیا۔

میں جانتا ہوں میری اتنی بہت ہی پیاری اتنی ہے۔ زبردہ بے اختیار اس سے پٹ گیا۔

○
سازے نو سو چکے تھے۔ بھینک کو معمول کے مطابق نو سو گھنٹ پہلے بند ہو جانا چاہیئے تھا
مگر اس شام سریشوں کا رخ کچھ زیادہ تھا۔ راشد شک چکا تھا اس نے اپنے کپڑے کو آرازی
”خاص! کوئی ہے؟“

نیاض اندر آگیا۔

”سرا ایک خاتون بیٹھی ہے۔“

”بیجج وہ اسے۔“

نیاض ڈسپنری میں واپس چلا گیا۔

راشد پیشانی دائیں ہاتھ سے لٹکائے اور بائیں کہنی میز پر ٹکائے متعلل انداز میں بیٹھا تھا

کہ اسے کپڑوں کی سرسراہٹ کا احساس ہوا۔

”کرایے کیا تکلیف ہے؟ اس نے مرلیض کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر کہا۔

”بہت تکلیف ہے ڈاکٹر صاحب؟“

یہ آواز سننے ہی راشد نے بے اختیاری کے عالم میں اپنے سامنے دیکھا۔ کوکب مرلیضوں

کے شول پر بیٹھی تھی۔ ایک خوبصورت اور قد، قیمتی ساڑھی میں لباس، نیلی آنکھیں جن میں بڑی

گہرائی تھی۔

”کوکب — تم! یہ کیا ذاق ہے آخر اس طرح آنے کی ضرورت کیا تھی؟“

”مرلیض اسی طرح ہی تو ڈاکٹر کے پاس آتا ہے، بتائیے اور کس طرح آتا ہے؟“

راشد نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے کوکب کو خاموش رہنے کے لئے کہا اور کچھ دیر کو

بلا کر کہا کہ وہ دلا چایاں میز پر رکھ کر چلا جائے۔ وہ یہ حکم سن کر چلا گیا۔

”آج آپ کی نئی آنٹی تھیں — اور انہوں نے وہ کچھ بتا دیا تھا جس کی کبھی توقع نہیں کی

جاسکتی تھی۔ کوکب نے اپنی مزین آواز میں یہ الفاظ کہہ کر ایک خاص توجہ کے ساتھ راشد

کو دیکھا۔

”کوکب! کیوں آخر اس کی توقع کیوں نہیں کی جاسکتی تھی؟“

”اس لئے نہیں کی جاسکتی تھی کہ آپ ڈاکٹر ہیں، ڈاکٹر کا کام مرلیض کا علاج کرنا ہے۔“

”کوکب! میں اس کا علاج ہی کر رہا ہوں۔“

”کیا اس طرح بھی علاج ہوتا ہے؟“

”کوکب! یہ عین کے مرض پر منحصر ہے کہ اس کا علاج کس طرح ہو۔ تم نے درست کہا ہے کہ یہ خلاف توقع علاج ہے۔ مگر بعض مرض بڑے ہی پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ان مریضوں کی شفا یابی کے لئے عوامی دواؤں کی نہیں انسانی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دانش نے عجز جذباتی مجھے میں کہا۔“

”کوکب یہ الفاظ سن کر بے چین سی ہو گئی۔“

”اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کے ساتھ غرا انسانی سلوک کیا جانے! غرا انسانی سلوک کس کے ساتھ کیا ہے میں نے ہر دانش نے غرا استفادہ کیا۔“
”مثلاً۔۔۔ میرے ساتھ؟“

”غلط۔۔۔ میں نے کبھی تم سے شادی کا عہد و میاں نہیں کیا۔ میں یہ پورے دثوق سے کہہ سکتا ہوں۔“

”دانش صاحب! کوکب نے اب اسے اس کے نام سے مخاطب کیا عہد بیان حرف غفلوں ہی سے نہیں اٹھاؤں۔ گناہوں اور بدعتوں سے بھی باندھے جاسکتے ہیں۔“
”یہ بھی نہیں ہوا؟“

”ہوا ہے۔۔۔ دانش! ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا ہے یاد ہے؟ یا انہماک سے آ رہی تھی اور ہم لوگ اسے رہسوار کے لبر پوڈٹ پر جا رہے تھے۔ میں تبدیلی گاڑی میں بیٹھی تھی اور تم گاڑی بڑی تیزی سے چلا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا آہستہ چلائیے۔ ایکسپڈنٹ ہو جائے گا۔ اور تم نے کہا تھا جہاز کے ساتھ مزاحیہ خوش قسمت ہے۔ اور جب تم نے ایم بی بی ایس کا آخری پرچہ دیا تھا تو میرے پاس آئے تھے اور کہا تھا: کوکب! ذرا کر دین کا یا اب ہو جاؤں۔ میں نے کہا تھا، میری ذرا سے بھلا کیا ہو گا۔ تم نے جواباً کہا تھا، میرے لئے تم جو بھی ذرا کر دگی قبول ہو جائے گی۔ یاد میں یہ باتیں؟“

”یاد ہیں۔“ راشد نے کہا

”اور تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ ایک بار میں اور تم آؤ انگ کر کے گھر آئے تھے تو تمہاری اتنی نے کہا تھا، راشد بڑے خوش نظر آتے ہو۔ اور تم نے کہا تھا: آج میں پیچہ خوش ہوں۔ تم مسکانے لگے تھے اور میں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کوکب دو لمحے رُک کر بولی: راشد! یہ سب کچھ کیا تھا، کیا تم نے مجھ رکھا تھا کہ مجھ پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ میرے اندر احساس کی کوئی قوت نہیں ہے۔ میں احساسات سے بے بہرہ ہوں۔ میں توقع نہیں کرتی کہ میں خواب نہیں دیکھ سکتی؟“

راشد نے کوکب کی جذباتی بات بڑے تحمل سے سنی اور بولا،
”کوکب؟“

کوکب نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔

”یہ سب کچھ ایک طرف ہوا ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”کوکب! میں نے تم سے کوئی امید یا غصہ، کوئی خواب دیکھنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ یہ جہاں اپنا معاملہ ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں“

”جگیا یہ میری غلط فہمی تھی؟ کوکب نے پوچھا

”میں یہ بھی نہیں کہتا۔ فقط یہ کہتا ہوں کہ میرا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے؟“

کوکب نے ان آنکھوں سے اسے دیکھا جن میں آنسو آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

راشد نے اپنے دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے اور تنہا بیٹھا رہا۔ دیر تک بیٹھا رہا۔

شادی کی تقریب ایک مقامی ہوٹل میں انعام پائی۔ راشد کے کچھ ڈاکٹر دوستوں نے شرکت کی اور ڈھین کی طرف سے اس کے چند عزیز آئے اور جب ڈھین نے پہلی مرتبہ راشد کے بچان

کی دلہیز پر قدم رکھا تو اس کی ساس لے لے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ ناخروہ کو ان بازوؤں میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ یہ کیفیت وہ ان لمحوں میں محسوس کرتی تھی جب بچپن میں اس کی ماں لے لے گود میں اٹھا لیتی تھی۔

ناخروہ کی حالت میں ایک واضح طور پر قبضہ آرم ہوا تھا۔ پہلے اس کا صبح و شام کام یہ ہوتا تھا کہ لوہے پر اپنے کمرے میں جا کر چادر و یو لاری میں خود کو مقید کر لے اور کتابوں کا مطالعہ کرتی رہے۔ گھر کے کاموں میں وہ بہت کم دلچسپی لیتی تھی۔ تفریحی شغل سے توڑے کوئی واسطہ ہی نہ تھا لیکن اب وہ بڑے شوق سے اپنی ساس کا ہاتھ بٹاتی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ باہر جا کر بھی گھوم پھراتی تھی۔

ابھر پھر وہ وقت آگیا جب اس نے اپنے اندر کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی محسوس کی۔ دلائل اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ کھڑکی میں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شوہر کو آتے دیکھ کر جھینپ گئی تھی۔

”ماشاء اللہ اس کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا۔“

”کیا دیکھ رہی ہو ناخروہ؟“

”کچھ نہیں۔ وہ محبوب ہوئی جا رہی تھی۔“

”شاید چاند کو دیکھ رہی ہو۔ عورت کی اپنی گود میں جب چاند گسنے والا ہوتا ہے تو اسے آسمانی چاند سے بڑی دلچسپی ہو جاتی ہے۔“

ناخروہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

وقت سترہ پر ناخروہ کی گود ایک جڑی بیاری اور خوب عورت بچی سے بھر گئی۔ اس نے اپنے وجود نے گھر کی رونق کو بہت بڑھا دیا تھا۔ ناخروہ کا آسانی محض ایک خواب بن کر رہ گیا تھا اور شاید بڑا خوش تھا کہ اس کا ایثار وایتھال نہیں گیا۔ اس نے اپنی قربانی سے ایک ایسی لڑکی کی اداسیوں کو دور کر دیا ہے جو زندگی کی ساری محنتوں سے ایسے ہر بچی تھی۔ اور

جو اپنی زندگی کو زندگی کی سزا قصود کر رہی تھی۔

جیسے جیسے ناخوہ اودہ راشد کی بچی ٹینڈ کی عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کی خوبصورتی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جب اپنی توتلی زبان میں کوئی بات کہنے کی کوشش کرتی تھی تو اس کی ماں کا چہرہ دغور مسرت سے گلزار ہو جاتا تھا۔ دن پردن گزرے جا رہے تھے یوں چار سال کی مدت بہت گئی۔

ٹینڈ خامی صحت مند بنی تھی۔ کبھی کبھی اسے بچوں کی عام تکلیف ہو جاتی تھی اور ماں باپ کی توجہ سے تھوڑی دیر بعد خود ہو جاتی تھی۔ اور اس شام جب ناخوہ نے اس کا بدن خدا حرم دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔ کیونکہ اس کے پہلے بچے کا جسم بھی اسی طرح گرم ہو گیا تھا۔ اس نے کیلنک میں راشد کو نوٹوں پر اپنی بچی کی کیفیت بتائی اور اسے باعراہ جلد آنے کیلئے کہا۔ راشد نے اسے تسلی دی۔

”مکرمت کرو ناخوہ! موسم بدل رہا ہے۔ یہاں بھی بہت سے بھاد میں مبتلا لوگ آئے ہیں۔ مگر ناخوہ نہ جانے دل میں کیسا خوف غمیں کر رہی تھی کہ اسے ٹینڈ کے پاس بیٹھے جڑنے چھین ہی نہیں آتا تھا۔ اس کی ماس نے بھی ہر چند تسلی دی لیکن وہ صفر غمی کو راشد کو خدا آجانا چاہیئے، ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرتی چاہیئے اور ادھر راشد بیوی کے بار بار ٹیلیفون آنے پر حرف بھی کہے جا رہا تھا۔

”ناخوہ! اتنے مزیدار چھوڑ کر میں کیسے آسکتا ہوں اور پھر کوئی نلک کی بات ہو جب ناخوہ نے راشد آیا۔ کھانا کھانے سے پہلے اوپر کمرے میں گیا۔ ناخوہ ٹینڈ کو گود میں لئے کمرے کے اندر ٹھیل رہی تھی۔ اس نے بچی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی عزم تھی۔

”جلدی کیوں نہیں آئے؟ ناخوہ کا لہجہ تلخ تھا۔

راشد نے تھکی سے کام لیا۔

”تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہو۔“

”خزاہ خزاہ پریشان ہو گئی ہوں — بدن کرنے کی طرح نہیں جل رہا — مریض چھوڑ کر نہیں آ سکتے تھے — انہیں دوسرے روز نہیں دیکھ سکتے تھے — بری بچی کی حالت — میں نے بتایا نہیں تھا کہ بیمار ہو گئی ہے — تمہیں اپنے مریضوں کی پڑی رہی — اس سے بے پروا ہو گئے —“

”نہیں ایسی بات نہیں خاخرہ! راشد نے بچی کو بھڑکی کی گود سے اٹھا کر اپنے سینے سے دگایا۔

”شام سے نہ سکواتی ہے نہ کھلونوں سے کھیلتی ہے — خاخرہ نے منظر یاد کیا۔

”بس یہی بات ہے — باکمال کرتی جو۔ بچوں کی طبیعت نرم گرم ہوتی رہتی ہے۔ ابھی سکلنے لگی، کھلونے لٹکے گی، ہنسنے لگی، قہقہے لگائے گی، رکتھتی جائے گی، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

راشد خنید کو گھڑیا کہا کرتا تھا اور جب وہ یہ الفاظ کہہ رہا تھا تو اسے قہقہے تھقی کر ٹینڈ ضرور کچھ نہ کچھ کہے گی، مگر وہ چپ چاپ باپ کے کندھے سے اپنا سر دگائے خیم دا آنکھوں سے سامنے دیوار کو دیکھتی رہی۔

راشد نے اسے دہرا پلائی۔ دوا کے بعد لگتا تھا کہ اس کی پہلی سی حالت عود کر آئی ہے۔ لیکن وہ پھر ویسی کی ویسی ہو گئی۔

خاخرہ نے اسے بار بار بلایا۔ اور وہ خوب صورت گھڑیا اس کے پاس بنگ کے اوپر رکھ دی جسے وہ چند روز پیشتر اس کے لئے خرید کر لائی تھی اور جسے اس نے بچہ پسند کیا تھا۔ ٹینڈ نے گھڑیا کو آغوش میں لیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لٹا لیا۔

گیارہ بجے کے قریب اسے تھیں آگئی اور جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ راشد نے اسے انجکشن لگایا، تھوڑی دیر بعد ایک ادتے آگئی۔

خاخرہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ مسلسل کانپنے جا رہی تھی۔ راشد کی سمجھ میں یہ معاملہ نہیں

آ رہا تھا۔ اس کی انی بھی لڑ پڑا گئی تھی۔ بچی کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ راشد نیچے گیا ماس نے اپنے ڈاکٹر دوستوں کو فون پر جلد آنے کی تاکید کی اور دو ڈاکٹر آ گئے۔ وہ جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کیا۔ مگر صبح چار بجے ٹینڈ کا جسم میسر کے لئے بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

ناخروہ کی حالت ایسی تھی کہ فریڈ مایوسی سے وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی جیسے غربت گریبان سے محروم ہو گئی ہے وہ دیوار سے لگ کر کھڑی تھی۔

ماشد نے آہستہ سے ماں کے کان میں کہا:

”انی! اسے نیچے لے جاؤ۔“

ماں ناخروہ کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی،

”آؤ بیٹی!“

ناخروہ چلنے لگی۔ یکایک وہ ڈک گئی، ٹینڈ کے پتنگ کی طرف آئی اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ گزرایا کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس نے گزرایا انصالی اور سب کو حیران و پریشان چھوڑ کر خود بخود سیر میزوں سے اترنے لگی۔ اس کی سانس پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ناخروہ ایک کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ سانس چند منٹ بعد لڑے پر ڈک کر اسے دکھیتی رہی۔ ناخروہ نے کوئی حرکت نہ کی تو وہ اُڑ پڑا گئی۔

تجسیر و تکفین کا کام بڑی خاموشی کے عالم میں ہو گیا۔

ٹینڈ کو گئے ہوئے کئی گھنٹے لگ رہے تھے اور ناخروہ کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہیں گرا سکا اور یہ صورت حال خطرناک تھی۔

سادے گھر میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ناخروہ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی تھی۔

گزرایا اس کی گرد میں تھی۔ راشد دو تین بار اپنی ماں سے کہہ چکا تھا: ”انی! اسے زلاؤ تاں نے جب آخری بار بیٹے سے یہ لفظ سنے تو ناخروہ کے پاس آ بیٹھی

”ناخروہ! تمہاری ٹینڈ مر گئی ہے۔“

ناخروہ نے سانس کو دیکھا اور سر جھٹکالیا۔

”ناخروہ بڑی! ٹینڈ مر گئی ہے۔۔۔ اشکی گڑیا مر گئی ہے۔“

اس کا بھی ادھی برقعہ تھا۔

اس کی سانس کی کھجور میں اور کچھ نہ آیا۔ اس نے بہو کی گود سے گڑیا لینے کی کوشش کی۔

یہ ایک ناخروہ تڑپا نہی۔ اس نے تڑپا سانس کے لمبے لمبے چھین لی اور نہ نہ کہتی ہوئی دست

نیلے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ اب آنسوؤں کا سبب تھا کہ تھکے کا نام ہی نہیں بتاتا تھا۔

آٹھ دن گزر گئے۔

ناخروہ معمول کے مطابق سانس کا کام ہاتھ بٹانے لگی اور جب بھی اسے کانوں سے فرسٹ ملتی

تھی وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ گڑیا کو کھلے سے لگا کر کمرے میں بیٹھ جاتی تھی اور

دیر تک اسی طرح بیٹھی رہتی تھی۔ خیالوں میں غم منم۔ کھوئی کھوئی سی۔

انس نے موقع پا کر گڑیا چھپا دی تو وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کے پاس نہی۔

”اماں! وہ تو نہ چھینیں۔۔۔“

”وہ کیا ناخروہ بیٹی؟“

”وہ۔۔۔ میری گڑیا۔“

اماں نے اسے گڑیا سے دی۔

ان کو پوتے کی بڑی آرزو تھی اور ایک روز وہ اپنے بیٹے کو بتائے بغیر بہو کو ہسپتال

میں سے گئی۔ ایڈی ڈاکٹر نے چیک کیا اور اسے یہ اذیت ناک خبر بتائی کہ غار جان، آپ کی

بہو کے اندر کچھ ایسی خرابی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر آئندہ بچہ برا تو اس کی زندگی خطرے

میں پڑ جائے گی۔ اماں نے یہ خبر سننے کو بتائی تو اس کی بھینک ناخروہ کے کانوں میں بھی

پڑ گئی اور اس پر گویا کتے کا عالم طاری ہو گیا۔

اس چھوٹے سے گھر میں اب ایک دوسرے سے الگ الگ اور کافی فاصلے پر دو جزیرے سے آباد ہو گئے تھے۔ ٹکروا نڈیشکی گھریں اٹھ اٹھ کر دم بدم ان سے ٹکراتی رہتی تھیں اور ان کے درمیان دودی کسی صورت بھی کم نہیں جوتی تھی۔ راشد کے لئے یہ صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ اپنی کشتی بھی ایک جزیرے تک لے جاتا تھا اور بھی دوسرے جزیرے تک، مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دودی جو پیدا ہو گئی ہے وہ کسی خاص واقعے کے بغیر ختم نہیں ہو سکتی۔

اس دہے دہے غظظوں میں بیٹھے سے کہہ دیتی تھی کہ گھر کی دیواریں کے تم خود فسمے دار ہو۔ راشد اس کا اشارہ بھجھ دیتا تھا لیکن ناخروہ کو وہ اس کے حال پر چھوڑ کر اذ سر لڑا پنا گھر بسنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

ناخروہ پہلے سے بھی کم بولتی تھی، ایک بار وہ شام کے وقت کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی تو راشد نے بڑی محبت سے پوچھا:

”ناخروہ! تم کیا اندازوں میں دیکھتی رہی ہو۔“

وہ اسی انداز میں کھڑکی رہی اور کہنے لگی:

”دیکھو راشد! وہ چاند کی سیوٹ، وہ بادل، وہ اتنی کتنی دور ہے۔ اور انسان کے ہاتھ کتنے چھوٹے ہیں۔“

”تو میں ان سے کیا پوچھی؟“ — پوچھنا چاہتی ہو انہیں؟

”ہاں؟“

”ناخروہ! پاگل ہو گئی ہو؟ راشد نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا

ناخروہ کی آواز گھوگر ہو گئی، بول:

”ہاں، میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میں کہاں، وہ کہاں، جو چیز حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے کوشش پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے جو کچھ نہیں مل سکتا۔ وہ نہیں ملے گا۔ وہ نہیں ملے گا۔“

وہ زائد وقار درونے لگی۔

راشد اسے ہر طرح تسلیاں دیتا رہا اور وہ مسکایاں بھرتی رہی۔ ایک اندرون بیجان سے متواتر کانپتی رہی۔ اور ہلنگ پر گر پڑی۔

کوکب کو اتنے برسوں بعد اپنے گھر میں دیکھ کر راشد حیران رہ گیا۔

وہ پہلے جیسی تھی۔ غور و زنگ، سرخ و سفید، گہری یخی آنکھیں۔

”راشد صاحب! آپ نے میں اپنی ثنوی پر بلایا ہی نہیں تھا۔ ہم بھی ناراض ہو گئے تھے۔“

اس سے پیشتر کہ راشد کچھ کہے اس کی ماں بولی،

”کوکب بیٹی! اتنی مدت کہاں رہیں؟“

”پشاور میں، خالد جان! ان کا تامل واپس ہو گیا تھا۔“

شکارہ شکایت کی باتیں ہونے لگیں۔ کوکب ناخوہ سے مل کر بہت خوش نظر آتی تھی۔ سکرا سکرا کر اس سے گفتگو کرتی رہی۔ راشد کیلنک چلا گیا اور ناخوہ باورچی خانے میں کھانے وغیرہ تیار کرانے لگی تو اس کی ساس نے کوکب کو سارے حالات بتا دیے۔

”بیٹی! میری دلی تمنا تھی کہ اس گھر میں تو آئے۔ مگر راشد کے سر پر ایسا دکھ کا جنون سوار تھا کہ میں کیا کرتی۔ اب گھر ویران ہو گیا ہے۔ ہر طرف وحشت برستی ہے۔ دن رات ایک سناٹا ماحولی رہتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ دیر لینی کیسے حد ہوگی۔ یہ قبر کا سناٹا کیونکر ختم ہوگا۔ یہ زندگی۔ زندگی نہیں موت سے بدتر ہے۔ لگتا ہے ہم کسی اندھے کنویں میں گر پڑے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس کی تھڑکی آنکھوں سے آنسو گرنے لگی۔“

کوکب نے ساری باتیں خاموشی سے سنیں اور بولی،

”خالد جان! مجھے راشد سے کوئی شکایت نہیں۔ میری زندگی مطمئن ہے۔“

”مگر ہماری حالت — بیٹی !“

”کوکب کچھ سوچ میں پڑ گئی، چند لمحوں کے بعد بولی :

”ویسے خالہ جان! آپ کی ہوسو بڑی پیاری ہے۔“

”پیاری تو ہے، پر —“

”خالہ جان! بعض چیزوں پر انسان کو اختیار نہیں ہے۔“

دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور جب کوکب جہلے لگی تو ناخوہ سے کہنے لگی :

”اب آپ لوگوں کو ہمارے یہاں آنا ہو گا۔ میں راشد کے ٹیلیفون پر دن مقرر

کروں گی۔“

○

جمعہ کی شام کو کینٹک بند تھا اور یہ شام راشد کی اپنی تھی۔

وہ اور ناخوہ جب کوکب کے جنگلے پر پہنچے تو اس نے بڑی محبت اور مگر محبتی سے

دونوں کا خیر مقدم کیا۔ خاطر تواضع میں کوئی کسراٹھا نہ رکھی ناخوہ کو خوب سلوم تھا کہ کوکب راشد

کی کلاس میں تھی اور اس کی ذات میں بڑی دلچسپی لیتی رہی تھی۔ اس کی اور اس کے والدین

کی بڑی خواہش تھی کہ وہ راشد کے ہاں ڈھین بن کر جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا تو ناخوہ کو توقع تھی

کہ وہ دل ہی دل میں اس سے شاک ہوگی لیکن ایسے ویسے کا اظہار نہ تو اس نے ناخوہ کے

یہاں کیا تھا اور نہ اب اپنے گھر میں کر رہی تھی اور ناخوہ کو اس پر حسرت تھی۔

ساڑھے دس کا وقت ہو چکا تھا اور کوکب کے مہمان اپنے گھر جانے سے پہلے آخری بار

چائے پنی رہے تھے۔ کوکب سادہ وقت خوب خوب چکی تھی اب خاموش تھی۔

ناخوہ نے خالی بیال میز کے اوپر رکھ دی اور رختے لگی تو کوکب اس کے پاس آگئی۔

”ناخوہ! کیا میں ایک اچھی بہن نہیں ہوں؟“

ناخوہ اس سوال پر گھبرا گئی۔

”یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ اس نے اپنی طرف سے سوال کر دیا۔“

”میں نے اس کی عنودت محسوس کی ہے۔“

راشد اپنی بیوی سے مخاطب ہوا،

”فاخرہ! کوکب نے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دے دو۔“

”کیا جواب دوں! — بڑی اچھی ہیں۔“

”بہن کی طرح نا؟“

”کیوں نہیں؟“

”ترجئے اپنی بہن سمجھتی ہو — اس ایک بہن اپنی بہن کو کچھ دے تو بہن خوشی سے قبول

کر لیتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے کوکب کمرے سے نکل گئی اور جب لوٹی تو اس نے اپنے

ہاندل میں اپنی سولی ہلایک سالہ بچی کر میٹ کر اٹھا۔

”یہ کچ سے جہادی بچی ہے۔“

فاخرہ کوکب کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ راشد اپنی کرسی سے اٹھ بیٹھا۔

”میرے شوہر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں — کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔“

کوکب فاخرہ کے قریب ہو گئی — اصر قریب ہو گئی اور بچی اس کی باتوں کے حوالے

کر دی۔

کوکب! اتھار یا بہت بڑا احسان ہے لیکن ایسا ہو گا کیسے؟ راشد نے پوچھا۔

”کیا میں نے بتا نہیں دیا کہ میرے شوہر اور اس کے عزیزوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

میرے مدہ پتے اور حسودہ ہیں — میری یہ بچی میرے اپنے گھر میں رہے یا آپ کے گھر میں،

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

کوکب! صرف یہی نہیں تھا اور بھی کئی باتیں ہیں۔“

کوکب مدہ تین لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی،

”شیک ہے کچھ اور باتیں بھی ہیں — مثلاً بچی اس سے خدا کیسے ہو سکتی ہے؟ اتفاق یہ

ہے کہ یہ مجھ سے زیادہ مانوس نہیں ہے۔ مانوس ہے اپنی آیا سے جو اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ یہ آیا بچی کے ساتھ ہی جائے گی:

فاخرہ چاند میں پٹی پہنی ہوئی بچی کو گود میں لئے کھڑی تھی۔

”یہ برا تحفہ قبول ہے؟ کوکب نے سُسکا کر پوچھا؟

”جی ہاں، فاخرہ کے ہونٹوں سے حرف بھی ایک لفظ نکلا۔

”یہ آج سے آپ کی ہے۔ میں آیا نہیں کروں گی۔“

”کیوں نہیں آیا کریں گی؟ یہ آپ کی ہے۔“ فاخرہ نے کہا۔

”میری نہیں فاخرہ، بہن! آپ کی۔“ کوکب نے فاخرہ کی طرف انگلی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گود میں بیٹھے وقت کوکب نے بچی کی پیشانی چُوم لی، جس سے وہ جاگ اُٹھی اور رونے لگی۔ جلدی سے آیا نے اسے گود میں لے لیا، اور وہ چپ ہو گئی۔

”انی! ہم ایک تحفہ لے کر آئے ہیں، زائد نے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تحفہ!۔ کیا تحفہ؟“

”وہ تحفہ انی! جو فاخرہ کے لئے ہے، میرے لئے اور آپ کے لئے بھی، جس سے اس گھر کی

ساری بددیت دور ہو جائے گی، جس سے اس گھر میں رونٹنی آجائے گی۔“

آیا اندر آگئی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ انی نے پوچھا

”دیکھ لیجئے انی!“

تیا نے بچی کی طرف اشارہ کیا، انی اسے گود میں لے کر جہاں نکلوس سے بیٹے کو دیکھنے لگی

”انی! یہ آج رات سے پہلے کوکب کی تھی، آج فاخرہ کی ہے، یعنی فاخرہ اس کی ماں ہے۔“

میں باپ اور آپ شفیق دادی جان۔

راشد نے اسے مارا قصہ سنا دیا۔

”کتنی بڑی قرمانی! آئی کے منہ سے بے ساختہ نکلا

”یہ ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔“

”بیٹا۔“ اسی بیٹے سے کہنا چاہتی تھی کہ تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس نے کیا

کیا۔ مگر وہ خاموش ہو گئی۔

راشد نے یوپی سے کہا کہ بچی کہیں جاگ نہ پڑے اسے اوپر لے جائے اور ناخروہ اسے

عمود میں لے کر اوپر جانے لگی۔ جب اس نے تدریسی میز دھیاں طے کی ہوں گی کہ انجی ہوئی!

”راشد! یہ تمہاری یوپی کچھ خوش نظر نہیں آتی؟“

”خیر انہی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ اس کے دل کی کیفیت سمجھ نہیں سکتیں۔ کبھی کبھی

خوشی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انسان اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔“

انہی سطلین ہو گئی۔

بچی ناخروہ کے سپل میں سو رہی تھی اور راشد اپنے پلنگ پر لیٹ چکا تھا۔

”ناخروہ؟“

”جی۔“

”کیا یہ تجربہ نہیں ہے۔ کتنا ایثار ہے یہ۔“

”راشد صاحب! میرا خیال ہے اس وقت آپ کو بہت افسوس ہوا ہو گا۔ آپ

بڑے پریشان ہوں گے۔“

”کس بات پر ناخروہ؟“

”آپ ہنسے کیوں نہیں۔ آپ کی انہی بھی یہ کہنا چاہتی تھیں کہ تم نے کوکب کو نظر انداز

کر دیا اور اس نے۔ بات بالکل ٹھیک ہے۔ ایک حقیقت ہے۔“

راشاٹھ کر بیٹھ گیا۔

’جر جو چکا سو ہو چکا۔ مجھے اس پر کوئی افسوس، کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ میں نے
خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ سمجھ لیا۔‘
ہنکریہ:

’اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کہتے ہوئے رشا کی نگاہ کچی پر پڑی جو اسے بڑی پیاری
لگ رہی تھی۔

’کتنی پیاری ہے، ناخرو! معلوم نہیں کوکب نے اس کا کیا نام رکھا ہے۔ ہم اسے ٹینے
کہیں گے۔‘ ناخرو خاموش رہی، اس نے اپنی دھانسی یا ضرر دھانسی کا اظہار نہ کیا۔

○

راشا دیکھ رہا تھا کہ ناخرو ٹینے کی ذات میں بہت کم لپٹی رہی ہے۔ اس کی ہاں کا
بھی یہی احساس تھا۔ دونوں اُس کے رویے پر پریشان تھے مگر صبر و تحمل کا ثبوت دے دے رہے
تھے۔ امی ناخرو کی خبر سوچ لگی میں اپنے بچے سے بہرے بچی کے ساتھ اس غیر مادرانہ سلوک
پر کڑھتی تو راسخا اسے دہرا کر نے کا مشورہ دیتا بلکہ درخواست کرتا کہ وہ مزید انتظار کریں۔
ناخرو کا رویہ آہستہ آہستہ درست ہو جانے لگا۔

ٹینے بیشتر وقت آباہی کے پاس رہتی، وہی اسے دودھ پلاتی، نہلاتی، کھلاتی، کپڑے
بدلتی، اپنے ساتھ سلاتی، ناخرو کبھی اسے گود میں لیتی بھی تو ناگوارائی کے عالم میں، اور اس کی
کوشش یہی ہوتی کہ اسے جلسے جلسہ اپنی آغوش سے نکال دے۔

اُس روز رانی کسی چوس کے گھر سے واپس آئی تو دیکھا کہ بچی کمرے میں تہا باندھ کر
رہ رہی ہے، آباہی اور بچی خانے میں ہے۔ اور ناخرو غائب ہے۔ وہ فوراً بچی کو تہا باندھ کر
کمرے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے اور اس کی گود میں غڑیا بیٹھی ہے۔

یہ منظر دیکھ اس کے اندر یک لخت غصے کی آگ بھڑک اٹھی، رانی مڑھلی

ناظرہ! تمہیں معلوم نہیں کتنی نیچے بڑی طرح دور رہی ہے:

”تو اس کی آیا کہاں ہے؟“

”اس کا خیال رکھنا بہت آیا ہی کا فرض ہے؟“

”ہاں! اناں جان، کوکب نے اس کی فرض سے ساتھ بھیجا تھا۔ ناظرہ نے جواب دیا۔

”اور تیار کوئی نہیں؟“ — کہیں گنگولیاں ہو، کچھ دو روکر جگہاں ہو رہی ہے

اور تم دو پر مزے سے کتاب پڑھ رہی ہو۔“ کیا کوکب نے اپنے بڑے کا کڑا اس لئے تیار ہے

سوالے کیا تھا کہ اُس سے ایسی تیار نہ ہے یا نہ ہی برتو۔ اس نے تو تم پر رحم کیا کراہتی پئی

دی تھی۔“

ناظرہ نے ٹوٹی سے اٹھتے ہوئے کتاب اور لٹریا پانی پر رکھ دیں۔

”اُن اُمیں نے اُس سے رحم کی درخواست نہیں کی تھی۔“

”احسان کا بدلہ لیں چکایا ہوا ہے؟“

”اس نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ — کیا سے تو آپ لوگوں پر کیا ہے؟

”ماں تم ہر اس کی۔“

”میں اس نہیں ہوں۔“ ناظرہ کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی۔

اتنی کا چہرہ اور مڑخ ہو گیا۔

”کیا کہتی ہو؟“ — تم اس نہیں ہو۔“ کوکب نے تمہیں کیا مجھ کراہتی پئی دی تھی۔“

”یہ میں نہیں جانتی۔“ — بہر حال میں اس کی اس میں ہوں۔ اس نے میری کوکھ سے

جہم نہیں لیا۔ اس کی دلوں میں میرا ہو نہیں ہے۔“ — یہ میرے وجود کا حاتمہ نہیں ہے۔۔۔ میں

سے کیسے اپنی پئی مجھ کو گود میں لے لوں۔ میں کیا گنتی ہوں اس کی قسمت کو یہ منظور نہیں

سے کو میری گود میں میرا اپنا بچہ ہو۔“ دلوں بچے اس نے چھین لئے۔ کیا اب میں غیروں

سے اُن کے بازو پھیلاؤں کہ خدا کے لئے میری گود بھرو۔“ — مجھ پر رحم کھاؤ۔ اُن اُمیں اس

کے لئے تیار ہیں۔

خانہ ان لکھوں میں سے کسی ایک سے مخاطب کون ہے۔ جو کچھ دل میں آتا تھا وہ سچے سچے پیغمبر کے چاروں ہی تھی۔

”اور تم اس کے لئے تیار ہو کر اس بے جاں نژاد کو اپنی گود میں بھانے رکھو۔ اسی نے غضب ناک نظروں سے تپائی پر پڑی مہولی ٹھٹھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہاں۔۔۔ یہ میری بجٹی کی تھی۔“

”ہاں۔۔۔ یہ میری بچی کی تھی۔“

اور وہ زندہ بچی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔۔۔
ایسی سمجھیں؟

بہارِ کربلا

کیا باہمی کے غصے کا پارہ بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ دو گھر کے بڑھی جڑیا کر اٹھایا اور اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

انہوں نے: خاخرہ کا جسم مرنے تک وہ دھم سے ٹکری کے اوپر جھک رہی تھی۔
قیام پکڑ کر گرو میں اٹھنے کے لیے آگئی تھی، خاخرہ کو اس طرح گھسے دیکھ کر
آئیہو نے بی بی — بی بی کہنے لگی۔

اسی پر منظر دیکھ کر پریشان ہوئی تھی۔ اس نے ناخو کا ہاتھ پکڑا کر دوتین، ناخو ! ناخو ! کہا۔ ناخو نے ہوش ہوئی تھی۔

اسی نے آیا کو وہیں ٹھہرایا۔۔۔ بیڑیوں سے نیچے اُتری۔۔۔ یہاں۔۔۔ میں بیٹے کو صوبت نکال کے مطلع کروا۔

ماشد کے آنے تک بخارہ کے سر سے کلائی ہو یہ چکا تھا۔ راشد نے اس کے سر پر ٹپی
 ہانسی اور اسے جھگہڑا دیا

دو گھنٹے کے بعد اس کی حالت تندرست ہو گئی۔ گلاب وہ انتظار کر رہی تھی کہ اسے اس کی بہن کے گھر میں پہنچا دیا جائے وہ یہاں نہیں رہے گی۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں

رہے گی۔ ایک بار وہ ہنگ سے اٹھ کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بھیجا ہنگ
تھی۔ اگر راشد عجلت تمام سے اپنی گرفت میں نہ لیتا تو وہ سڑکیوں سے نیچے اتر جاتی۔

اپنی کاٹنے جو ناخوار کو بیہوش دیکھ کر قہقہے کی طرح ہنس رہا تھا۔ پھر اُٹھ کر آیا تھا۔ وہ اپنے
سے بولی:

• راشد! اسے چھوڑ آؤ! اس کے گھر؟

راشد نے ماں کو صبر سے کام لینے کی تلقین کی تو وہ پھر گئی۔

• میں کہتی ہوں اسے چھوڑ آؤ!

ناخوار نے ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا۔ دروازے پر پہنچی گئی۔ راشد نے دوڑ کر اس کا ہاتھ

پکڑ لیا۔

• دیکھو ناخوار! عقل سے کام لو! راشد نے اسے آخری سڑکی پر پہنچ کر کہا۔

• نہیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں دوبارہ سے سڑک پر جان سے دوں

گی۔ کہہ رہی ہوں۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں

رہوں گی۔

دندہ مجبور ہو گیا، اس نے اسے کھڑکی میں ٹھہرایا۔ کھڑکی دروازہ پر مبنی۔

انہی اور آیا۔۔۔ دونوں نیچے آگئیں۔

• آیا! انہی نے آیا سے مخاطب ہو کر کھائے جانے سے۔

آیا کھڑی رہی۔

انہی کوک کر بولی:

• لے جاؤ! اسے جہاد سے لائی ہو!

آیا جانے لگی۔

○

سرد ہی کچھ، وہی کہہ ہیں، وہی کھڑکی دروازہ پر مبنی، اس دینا سے نکل کر وہ ہیں بنا

میں گھنی تھی وہ اسے ایک خواب عروس ہونے لگی تھی۔ سب کچھ کتنی جلدی ختم ہو گیا تھا جیسے ایک دم بلندی سے اسے نیچے دھنکاوے دیا گیا ہو۔ جیسے وہ کسی اجنبی حجرِ سرے کی سیاحت کے بعد پھر اپنے پرانے ساحل پر اتر گئی ہو۔

اس کی بڑی بہن نامرہ اسے دیکھ دیکھ کر ٹوٹتی رہتی تھی وہ اب اسے ایک طرح واپس جان سمجھنے لگی تھی۔ اُسے روتے ہوئے دیکھتی تھی تو کہتی تھی : ناخرہ ! تو ہے ہی بد نصیب کوئی تیرے لئے کیا کر سکتا ہے؟ یہ تیری بد نصیبی میں بھی اسے ڈوبل ہے۔

بہن کا یہ سلوک اس کے لئے بغیر متوقع تھا تاہم وہ کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔

یہی حالت تھی جب کوکب اس گھر میں آئی۔ نامرہ گھر کے کام میں مصروف تھی اور ناخرہ اُد پر اپنے کمرے میں تھی۔

نامرہ نے کوکب کا نام منور نہا تھا مگر اسے دیکھا کبھی نہیں تھا اُسے اپنے ریلوں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”آپ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی ہیں۔“ میرا نام کوکب ہے۔ راشد بھائی کی ذمہ کی رشتہ دار ہوں۔

”آئیے۔“ تشریف دیکھئے :

کوکب بیٹھ گئی۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے ناخرہ کا حال پوچھا نامرہ گویا پھٹ پڑی : کیا بتائیں اس کا کیا حال ہے ! مصیبت میں جان ڈال دی ہے اس نے۔ میرے بڑے بھائی کے لئے درجنی سے ہم دونوں کے لئے ٹکٹ بھیج دیئے ہیں۔۔۔ کاغذات بھی تیار ہیں۔۔۔ پر اس کا کیا ہے گا ! پریشان ہیں۔۔۔ بد نصیب سدا کی بد نصیب ہے۔“

کوکب اُد پر چلی گئی۔

”معاف کیجئے گا ! اجازت کے بغیر آپ کے کمرے میں آگئی ہوں :

ناخرہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اور اس نے اپنے اندر غرضدگی کے احساس کو

سراپٹ کرتے ہوئے پایا۔۔ اور اس احساس کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔

”میں ٹھکر گزرا ہوں کہ آپ نے میرا غیر سہم کیا ہے۔“ کوکب نے اس کے پاس چنگ کی پاختی پر بیٹھے ہوئے کھدنا خروہ نے اس کے لئے کڑی خالی کر دی لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔
 ”ناخروہ! جو کچھ ہوا ہے میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سنوں گی، نہ کہوں گی، فقط یہ
 پر چٹا جانتی ہوں کہ اب سوچا گیا ہے؟“

”کیا سوچنا ہے؟“

”قبیلہ دی بہن اور بیہوشی قربا ہر جانے والے ہیں۔ تمہیں خبر ہے؟“
 ”مجھے معلوم ہے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا؟ زندگی اپنے سارے دواڑے بند کر لے جب بھی ایک دواڑہ کھلا رہتا ہے
 جہاں کوئی دستک نہیں ہے؟“

”کوکب نے اس کے شانے پر دم تھوڑ رکھ دیا۔“

”اپنی اس بہن کے ہوتے ہوئے تم اس دواڑے کی طرف رخ کر دو گی؟“

”جب کوئی اور راستہ دکھائی دے تو آؤ گی کیا کرے؟“

”ناخروہ! سنو میری بہن! موت کا صرف ایک دواڑہ ہے۔ مگر زندگی کے بے شمار
 دواڑے ہیں کہیں کہیں دواڑے کو بند پاؤ گی؟“

”سب بند ہیں؟“

”تم نے کئی دروازوں پر تو ابھی دستک ہی نہیں دی؟“

ناخروہ کی آنکھیں جھپک جھپک گئی تھیں کوکب اپنی ماڑھی کے پلو سے اس کے آئینہ پر غصے
 لگی اس وقت اس کے ذہن میں خیال آیا یہ موت کون ہے! — یہ کیوں میرے آئینہ
 پر پونچھ رہی ہے اسے مجھ سے کیا ہمدردی ہے — کیوں ہے! وہ اپنا جھروہ بچھے

ہٹانا چاہتی تھی کہ ایک لذت اس کے ذہن میں آجائے۔ عورت جو بھی ہے سو ہے مگر اس نے اپنی طرف سے مجھے دنیا کی سب سے بڑی اور قیمتی چیز دی تھی۔ یہ وہی توبہ ہے۔ وہی۔

سناٹ کیجئے۔ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ ناخزہ نے اس کا لہجہ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟ اس لئے کرتی ہوں کہ تمہاری بہن ہوں۔ تم مجھے جو کچھ سمجھنا چاہو مجھ کو بتائی ہو۔ لیکن میں تو نہیں اپنی بہن ہی سمجھتی ہوں۔

شکریہ؟

اس روز کوکب شام تک ناخزہ کے پاس بیٹھی رہی اور جب جانے لگی تو وہ ناخزہ کو اپنے ہمراہ اپنے یہاں جانے کے لئے رضامند کر چکی تھی۔



ناخزہ نے کوکب کے عالی شان پچھلے میں بڑی گھبراہٹ محسوس کی۔ اس کے شوہر کی کوٹھی میں اس کے پرانے گھر کے مقابلے میں خاصی شاندار تھی مگر یہ جگہ تو کبھی اس کے خراب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے زیادہ گھبرانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوکب اور اس کے شوہر کا رزق اس کے ساتھ محدود تھا۔ کوکب اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ ناخزہ خود کو ایک طاعون گرد تصور کرنے لگی تھی۔ وہ ہر بات کو اپنے دل سے پسند کرتی۔ سب سے اچھے کرکٹیں چلی جائے گی مگر صبح سویرے ہی کوکب اس کے لئے بیڈ لفٹ کر آجاتی۔ آج بچہ گاڑی میں ٹھیکہ کو بٹھا کر باغ میں جانے لگتی تو کوکب ناخزہ کو بھی ساتھ بیٹھ دیتی۔ آیا کوکب کی ہدایت کے مطابق باغ میں جا کر کہیں ادھر ادھر ہو جاتی۔ ناخزہ نے اس کے پاس تہوارہ جاتی۔ بچی مدتی تو وہ اسے اٹھا لیتی۔

کوکب بچی کے لئے نئے کپڑے بناتی تو وہ ج۔۔۔۔۔ کے لئے کپڑا پسند کر لے۔

آیا تین روز کے لئے چھٹی لے کر چلی گئی تو کوکب نے ناخرو سے کہا کہ اسے ایسے یا اس
نظارہ لیا کر۔

ان تین دنوں میں تین زیادہ ناخرو ہی کے پاس رہی۔

کوکب کی ان کوششوں سے ناخرو بچی سے کسی تعداد میں ہونے لگی۔ بچی بھی اس سے
مانوس ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جب اپنے خستے خستے ہاتھ اس کی گردن میں جامل کر دیتی تو
ناخرو کو کچھ یوں محسوس ہوتا کہ اس کا وہ پیار جو ایڑیوں کے رجھوم میں کہیں بھٹک رہا تھا۔
اس کے دل کو سہلانے لگا ہے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی منزل کی طرف تیزی سے وہاں وہاں
تھی۔ اور وہ بچی سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہوتی گئی۔

○

تین دو روز سے نظر نہیں آ رہی تھی۔

ناخرو نے گھر کے ایک نوکر سے پوچھا:

”تین کہاں ہے؟“

”میں کیا جانوں بی بی! — بڑی بی بی گاڑی میں بٹھا کرے گئی تھی۔“

”کہاں؟“

”خیر نہیں۔“

ناخرو کوکب کے گھرے میں گئی۔

”کوکب بہن! وہ کہاں ہے — تین؟“

”یکوں پریشان ہو؟“ کوکب نے سوال کیا۔

”ہے کہاں؟“

کوکب دوتین لمحے خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی:

”ناخرو! اصل میں سالہا یہ ہے کہ اسے ایک اندرونی پیاری ہو گئی تھی — چند روز

علاج کے بعد لے آؤں گی اسے :-

”کیا ہسپتال میں ہے ؟“

”وہیں اس کا علاج ہو سکتا ہے ؟“

○

وہ ایک طوفانی شام تھی۔

ناخرہ اپنے کمرے میں بنگ پر بیٹھی تھی اور کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔

بادل زور سے گر رہا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اس نے کتاب اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی نظر اسے آگٹھی پرفینک تصویر پر پڑی۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ بادل پھر گر رہا۔

وہ بنگ سے اتر گئی۔ تصویر کے قریب گئی۔ اور قریب گئی اور ایک جذبہ بے اعتدال اس کے دگ دپے میں سرایت کر گیا۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ دروازے میں سے نکلی اور کوکب کے دروازے پر آ گئی۔

”کوکب! کوکب! آ! اس نے دروازے پر زور زور سے دنگ دیتے ہوئے کہا۔

کوکب نے دروازہ کھول دیا۔

”وہ۔۔۔ میری شین۔۔۔ وہ چماری۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔ کوکب خدا کے لئے مجھے اس کے پاس لے چلو۔۔۔ مجھے لے چلو کوکب!“

کوکب کا شوہر بھی وہاں آ گیا۔

”ابھی رات ہے ناخرہ! کوکب نے کہا

”یہ طوفانی رات۔۔۔ یہی تو وہ۔۔۔ مجھے لے چلو۔۔۔ میں کہتی ہوں۔۔۔“

”لے چلتے ہیں۔ کوکب کے شوہر نے کہا

چند منٹ بعد تینوں گاڑی میں بیٹھے تھے ناخرہ نے اپنا مگر گاڑی کی دلیوار سے لگا دیا تھا۔ اس کے چاچوں طرف اذہیر تھا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کوکب گاڑی کی اور کوکب اس کا ہاتھ پکڑ کر کہیں لے گئی

ایک دم روشنی ہو گئی۔

ناظر نے سامنے دنگ پر ٹینڈر مونسے ہونے دیکھا۔

میری ٹینڈر کہہ کر اس نے رچی کو گود میں اٹھالیا۔

یگا ایک اس نے اپنے سامنے ساس کو دیکھا۔ یہ اپنے شوہر کو۔ دونوں کی آنکھیں

چمک رہی تھیں اور وہ اپنے مکان کے کمرے میں تھی۔



تحریکِ آزادیِ فلسطین کے موضوع پر
اُردو کے تخلیقی ادب کا بھرپور اور توانا انتخاب

فلسطین اُردو ادب میں

نامور نقاد فتح محمد ملک کے تفصیلی دیباچے کے ساتھ

لکھنے والے

علامہ اقبال، ن۔ م۔ راشد، فیض، احمد ندیم قاسمی، افتخار حسین، اردو جعفری،
ابن انشا، قدرت اللہ شہاب، محمد کاظم اور دوسرے بہت سے ادیب
اور شاعر۔

شہر کے کسی بھی بکسے سٹال سے یا براہِ راست طلب فرمائیں

مطبوعاتِ خیریت
بیک روڈ، لاہور، فون : ۶۲۰۰۰۰

مضامین قرآن حکیم

یہ قرآنی کا حصہ ہے عظیم ہے کہ قرآنی ہی میں حضرت صحت کی اس کتاب کی حکم ہر ہی زبان کی ہر دلی ہے
مضامین قرآن حکیم کیا ہے ؟

۱- مضامین قرآن حکیم میں یہ وہ اصول و نمونہ آیت و آیات کی صورت کو چھوڑ کر انسانی صورت کے تحت پر آتی ہوئی
نہایت ہی اعلیٰ ترین اور کمال ہے ہر ہر انسان کے لیے یہ خط و کتابت کو ہر ہر آدمی کے لئے اس کا پسندیدہ اور گراں
مقدور کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں
آیات کو ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں
۲- مضامین قرآن حکیم میں یہ وہ اصول و نمونہ آیت و آیات کی صورت کو چھوڑ کر انسانی صورت کے تحت پر آتی ہوئی
نہایت ہی اعلیٰ ترین اور کمال ہے ہر ہر انسان کے لیے یہ خط و کتابت کو ہر ہر آدمی کے لئے اس کا پسندیدہ اور گراں
مقدور کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں

۳- مضامین قرآن حکیم میں یہ وہ اصول و نمونہ آیت و آیات کی صورت کو چھوڑ کر انسانی صورت کے تحت پر آتی ہوئی
نہایت ہی اعلیٰ ترین اور کمال ہے ہر ہر انسان کے لیے یہ خط و کتابت کو ہر ہر آدمی کے لئے اس کا پسندیدہ اور گراں
مقدور کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں
۴- مضامین قرآن حکیم میں یہ وہ اصول و نمونہ آیت و آیات کی صورت کو چھوڑ کر انسانی صورت کے تحت پر آتی ہوئی
نہایت ہی اعلیٰ ترین اور کمال ہے ہر ہر انسان کے لیے یہ خط و کتابت کو ہر ہر آدمی کے لئے اس کا پسندیدہ اور گراں
مقدور کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں ہر زبان کی ہر زبان کے لیے یہ کتابت کی صورت میں

یہ کتاب کا حصہ ہے عظیم ہے کہ قرآنی ہی میں حضرت صحت کی اس کتاب کی حکم ہر ہی زبان کی ہر دلی ہے
مضامین قرآن حکیم کیا ہے ؟

قرآن اور ادب

یہ کتاب کا حصہ ہے عظیم ہے کہ قرآنی ہی میں حضرت صحت کی اس کتاب کی حکم ہر ہی زبان کی ہر دلی ہے
مضامین قرآن حکیم کیا ہے ؟

یہ کتاب کا حصہ ہے عظیم ہے کہ قرآنی ہی میں حضرت صحت کی اس کتاب کی حکم ہر ہی زبان کی ہر دلی ہے
مضامین قرآن حکیم کیا ہے ؟

مطبوعہ
وہاب خان
ریاست

مصاحف احادیث نبویؐ

- یہ اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ ہماری ۱۰۰ صلیت پر مستحق کتاب مصاحفِ قرآن مجید کی ایک ہر ایک نئی و اصل غلطیوں میں بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔ مصاحفِ قرآن مجید کے بعد اب مجاہدیت عزت کی ایک اور عظیم کتاب مصاحفِ احادیث نبویؐ کے نام سے بعدِ تاریخ ہو جائے گی۔
- مصاحفِ احادیث نبویؐ کو اپنی نوعیت کی دوسری اور جامع ترین کتاب ہے۔ ساری تمام اہم صحاح و ترقیب و رد تہی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اور ایسے مصاحفِ نبویؐ بھی منتخب کئے گئے ہیں جو ان کے سامنے دوسری معاشرے کے جدید مسائل پر روشنی ہیں۔
- احادیث کا انتخاب عام طور پر گمانِ مست سے اور کسی کس سے نہ ہوگا۔ لیکن مستند کتبِ احادیث سے کیا گیا ہے۔ لہذا یہ مجموعہ مستند ہے۔
- کتاب کو ایسے ساروں کے ایک ہر ذمے مرتب کیا ہے جو قرآن مجید کے علوم میں جہاد کے ساتھ ساتھ انھوں کی امت کے ساتھ تمام نفع دہانہ اور بہت دیکھتے ہیں۔
- احادیث کا متن پیش کی جائے صرف ترجمہ و تفسیر ہے اور یہ ترجمہ و تفسیر اور ملاحذہان میں ہے اس وجہ سے اس میں حدیث کے تعلیم یافتہ افراد بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
- اس کتاب کا مقصد ہے کہ مصاحفِ احادیث نبویؐ کی شاعت کے بعد امتِ مسلمہ کو اپنی مسائل و معاملات کو سمجھنے میں اختلاف و اشتباہ کی آسانی ہو جائے گی۔
- یہ کتاب علماء و فقہاء، علماء و رجال، اور عام مسلمانوں کے لئے ایک قرآنِ مجید و احادیث کا جامع و جامع ترین کتاب ہے۔ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کی احادیث اس سے پہلے نہیں ہوئی تھیں لہذا یہ ایک منفرد کتاب ہے۔

[illegible]

- اُمتِ کلمب کا دل چننے کے لئے کوئی ایسا اُگرتہ نہیں۔
○ ہر کلمب کا غورِ قنات آپ کا اُمتِ جیسا ہوا کہ گا۔
○ آپ کے جواب کے سلسلے آپ کو جانی گا کہ ہم اُمتِ الیا کی کریں گے۔
○ کتاب کی تکرار پر آئے دلائلِ باطل و حودِ صریحہ ازخوابت ہم برداشت کیا کریں گے۔
○ دیکھیں یہ فیضِ معنوی دولت۔

[illegible]

انچارج، خرمیت، یک کلب، مطهرات خرمیت، چنگ روڈ۔ راولپنڈی

ہماری منفرد کتابیں

مضامین قرآن مجید	اردو تک	۱۰۰ روپے
علامہ مظاہب قرآن	پیشوا خانہ قرطبہ لاہور	۱۰۰ روپے
حرم و سزا کا اسلامی فلسفہ	پیشوا خانہ قرطبہ لاہور	۱۰۰ روپے
قرآن ایک نظریہ	سورہ مخزن کتب اسلامیہ لاہور	۱۰۰ روپے
قرآن اور ادیب	اردو تک	۱۰۰ روپے
اسلامی حدود و تعزیرات	ڈاکٹر حفیظ الرحمن لاہور	۱۰۰ روپے
خطبات رسول	پروفیسر حفیظ احمد لاہور	۱۰۰ روپے
مکتبہ رسول	اردو تک	۱۰۰ روپے
امالِ جنتی	اردو تک	۱۰۰ روپے
بعض ترب و تربت	مولانا محمد امجد لاہور	۱۰۰ روپے
پچاس ایک مطالعہ	اردو تعلیم سرور لاہور	۱۰۰ روپے
مسافر حرم	اردو تعلیم سرور لاہور	۱۰۰ روپے
حرفِ حرف روشنی خزانہ کلامِ قرمدرق		۱۰۰ روپے
مکتبہ نعیمیہ	۱۰۰ روپے	۱۰۰ روپے
مکتبہ افسانہ	شیخ محمد علی محمد لاہور	۱۰۰ روپے
مکتبہ شامی	اردو تک	۱۰۰ روپے
مکتبہ غزالیہ	اردو تعلیم سرور لاہور	۱۰۰ روپے
مکتبہ افسانہ	شیخ محمد علی محمد لاہور	۱۰۰ روپے

دینی کتب

افسانوی ادب

- | | | | |
|---------|------------------------------|---------|-------------------------------|
| ۳۰ روپے | ○ منتخب قرآنی محکمہ اسلامیات | ۱۰ روپے | ○ مشاہیر قرآنی محکمہ اسلامیات |
| ۲۵ روپے | ○ منتخب فلسفہ | ۳۰ روپے | ○ غلام صاحب قرآنی |
| ۳۰ روپے | ○ منتخب فلسفہ و ادب | ۵۰ روپے | ○ قرآن - ایک نظریہ |
| ۳۰ روپے | ○ روحانی پختگی | ۳۰ روپے | ○ قرآن اور ادب |
| ۲۰ روپے | ○ سائنس و ادب | ۵ روپے | ○ اسلامی حدود و تعزیرات |
| ۳۰ روپے | ○ غلام احمد | ۲۵ روپے | ○ خطبات دشمن |

طنز و مزاح

- | | | | |
|---------|--------------|---------|-----------------------|
| ۲۵ روپے | ○ شہید نائی | ۳۰ روپے | ○ ہم و سزا کا سوال |
| ۲۵ روپے | ○ طنز و مزاح | ۲۵ روپے | ○ اسلامی نظام عدالت |
| ۲۵ روپے | ○ جی سیل | ۲۰ روپے | ○ اسلامی قانونی دلائل |

سفرنامہ

نعتیہ مجموعہ

- | | | | |
|---------|--------------|---------|----------------|
| ۲۵ روپے | ○ مسافر نامہ | ۲۵ روپے | ○ نعتیہ مجموعہ |
| | | ۱۵ روپے | ○ نعتیہ مجموعہ |
| | | ۲۵ روپے | ○ نعتیہ مجموعہ |

تنقید و تحقیق

- | | | | |
|---------|-----------------|--|--|
| ۳۰ روپے | ○ تنقید و تحقیق | | |
| ۳۰ روپے | ○ تنقید و تحقیق | | |

سیاسیات

قومی مشاہیر

PAKISTAN AND THE ARAB
COLLECTIVE SECURITY SYSTEM
OZMAN AZAM
Rs. 20/-

AFGHANISTAN-SOME ASPECTS
OF POLITICS
OZMAN AZAM

STUDIES IN POLITICAL STRATEGY
OZMAN AZAM

- | | | | |
|---------|---------------|---------|---------------|
| ۳۰ روپے | ○ قومی مشاہیر | ۳۰ روپے | ○ قومی مشاہیر |
| ۳۰ روپے | ○ قومی مشاہیر | ۳۰ روپے | ○ قومی مشاہیر |

شاعری

- | | | | |
|---------|---------|---------|---------|
| ۲۵ روپے | ○ شاعری | ۲۵ روپے | ○ شاعری |
| ۲۵ روپے | ○ شاعری | ۲۵ روپے | ○ شاعری |
| ۲۵ روپے | ○ شاعری | ۲۵ روپے | ○ شاعری |